محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے: ایم۔فل اُردو

مقالہ نگار:

صائمہ میر

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۲۰ء

محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

صائمہ میر

یہ مقالہ

ایم۔فل اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۲۰ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اِس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: صائمہ میر رجسٹریشن نمبر:1455-Mphil/urd/S18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ ملک _____

نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

محمد بدر ملک _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں صائمہ میر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ ملک کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

_____

صائمہ میر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
• مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
• اقرار نامہ	iii
• فہرست ابواب	iv
• مقالے کا دائرہ کار	vii
• Abstract	viii
• اظہارِ تشکر	ix
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	**۱۔۵۹**
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۱
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۲
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع کا قبل تحقیق	۳
viii. تحدید	۴
ix. پس منظری مطالعہ	۴
x. تحقیق کی اہمیت	۴
ب۔ ادب اور سماج کا تعلق	۴
i. تعارف۔ ادب کیا ہے؟	۴
ii. ادب اور معاشرے کا تعلق	۶
ج۔ اُردو افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کی روایت	۱۱
i. پس منظر	۱۱

ii. افسانے کی تعریف ۱۳
iii. حقیقت نگاری کیا؟ ۱۵
iv. اُردو افسانے میں حقیقت نگاری ۲۲
د۔ محمد الیاس تعارف ۴۹
i. مختصر کوائف اور شخصیت ۴۹
ii. تصانیف ۵۴
حوالہ جات ۵۶

باب دوم: ''لوح ازل پر لکھی کہانیاں'' اور مو پنکھ پہ لکھی آنکھیں'' میں سماجی حقیقت نگاری کی مختلف سماجی حقیقت نگاری کی مختلف صورتیں ۶۱ ۔ ۱۱۲

الف۔ ۹۰ کی دہائی کے بدلتے تناظر میں سماجی حقیقت نگاری کی صورتحال ۶۱
i. بدعنوانی (فرشتے، ڈوگرہ، التکاثر) ۷۱
ii. استحصال (ایک بٹاچھ، اغوا، انا، ٹوڈا، عورت، گھوڑا اور مرد، وارے کی عورت، پانی ۷۷
iii. بے حسی (انسان، پوراتول) ۹۲
iv. منافقت (فتویٰ، قُفنس، گھوڑا) ۹۶
ب۔ لوحِ ازل پر لکھی کہانیاں اور مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں'' میں اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں کا جائزہ ۱۰۳
حوالہ جات ۱۰۸

باب سوم: ''دوزخ میں اک پہر'' اور منظر پس غبار'' میں سماجی حقیقت نگاری کی صورتحال ۱۱۳۔۱۵۸

الف۔ اکیسویں صدی کا منظر نامہ اور سماجی حقیقت نگاری کے موضوعات ۱۱۳
i. بدعنوانی (حیا، مجبور، ڈاکٹر لوگ، ڈائری) ۱۱۸
ii. منافقت (ایسی ویسی بات، درآمدی مہر، ملمع) ۱۲۶
iii. ظلم و ستم (امیر شہر کا ڈنکا، دوزخ میں اک پہر، بے نوا) ۱۳۲
iv. استحصال (محافظ، شاعر، سانولی سلونی، لنڈا اور ٹُنڈا) ۱۳۹
v. عورت کا استحصال ۱۴۴
vi. بے حسی (نیلام، عظیم فلاحی مرکز، کفایت) ۱۴۵
ب۔ ''دوزخ میں اک پہر'' اور ''منظر پسِ غبار'' میں سماجی حقیقت نگاری کے تناظر میں
اخلاقی زوال کی صورتحال ۱۵۱

حوالہ جات ۱۵۵

باب چہارم: ماحصل ۱۵۹۔۱۶۳

i. مجموعی جائزہ ۱۵۹

ii. نتائج ۱۶۲

iii. سفارشات ۱۶۳

حوالہ جات ۱۶۳

کتابیات ۱۶۴

مقالے کا دائرہ کار

راقمہ مقالہ نے اپنی تحقیق بعنوان محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ کا میدان منتخب کیا ہے۔ مجوزہ تحقیق میں چار افسانوی مجموعوں میں سماجی حقیقت نگاری کو پیش کرنا اور اخلاقی زوال کا سبب جاننا ہے۔ محمد الیاس ایک جرأت مند سماجی حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ لہٰذا اُن کی اِس انفرادیت کو سامنے لانا مقالے کا مقصد ہے۔ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب کے عنوان موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس باب میں موضوع کا تعارف، محمد الیاس کا تعارف اور مختصر کوائف شامل ہیں۔ دوسرے باب میں الیاس کے ۹۰ کی دہائی میں لکھے جانے والے دو افسانوی مجموعوں میں اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیہ ہے۔

تیسرے باب میں مصنف کے اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے دو افسانوی مجموعوں میں اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیہ کرنا ہے۔

چوتھا باب نتائج اور سفارشات پر مشتمل ہے۔

Abstract

Title: **Analysis of Social realism and cases of moral decline in the fictions of Muhammad Ilyas.**

The topic of my research work is to analysis of social realism and the causes of moral decline in the fictional work of Muhammad Ilyas.

The research primarily concerned with four-selected fictional work and to make an attempt to know the root cuase of moral decline.

Muhammad Ilyas has been recognized as daring social realist in the contemporary scenario. So in this regard, research purpose was to show off his individuality.

Research comprises into four major parts: First chapter deals with the introduction of the topic and the short introducation of the writer.

Second chapter followed the causes of moral decline in two fictional work and also their analysis which had been written in the time frame of 1990.

Chapter three discuss the issues of moral decline in the works written in twenty first century.

Finally, chapter four consist of findings and recommendations.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اُس ذات کا شکر ادا کرتی ہوں جس کے فضل و کرم سے تحقیق کے ہر مرحلے میں میرے لئے آسانیاں پیدا ہوئیں اور میں مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئی۔

ڈاکٹر نازیہ ملک نگرانِ مقالہ کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ اس کے بعد صدرِ شعبہ ڈاکٹر عابد سیال کی بے حد ممنوں ہوں جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر تحقیق کے اختتام تک اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر نعیم مظہر کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً رہنمائی کی اور میری کسی نہ کسی لحاظ سے معاونت کی۔

آخر میں اپنے گھر والوں اپنے والدین کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں کے سائے میں آگے بڑھتی چلی گئی جنہوں نے میری ہمت اور حوصلہ بڑھایا نیز مقالہ لکھنے کا وقت اور پُر سکون ماحول عطا کیا۔

صائمہ میر

سکالر ایم۔ فل اُردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

۱۔ موضوع کا تعارف:

سماج ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اُردو میں اس کے لیے لفظ معاشرہ مستعمل ہے۔ جو عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں۔ ایک صحت مند اور غیر صحت مند معاشرہ کا دار مدار وہاں رہنے والے لوگوں پر ہوتا ہے۔ جن معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے رویے، عادات مثبت ہوں تو وہ معاشرہ صحت مند معاشرے کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے۔ اور ایک صحت مند معاشرہ نہ صرف دوسرے معاشروں کے لیے مثال بنتا ہے بلکہ اسے ترقی اور عروج بھی نصیب ہوتا ہے۔ ادب میں حقیقت نگاری سے مراد کسی بھی شے کو اُس طرح پوری صداقت سے بیان کیا جائے گویا سماج حقیقت نگاری سے مراد معاشرے میں پائی جانے والی کسی بھی مسئلے کو اس طرح پیش کرنا کہ اُس کا کھردراپن اور حقیقت سامنے آجائے۔

محمد الیاس ۹۰ کی دہائی میں اُبھرنے والے ایسے افسانہ نگار ہیں کہ جن کہ ہاں جرات مندانہ اور بے باک انداز ملتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے معاشرے کی ان برائیوں اور عادتوں کی نشاندہی کی ہے جو کسی بھی معاشرے کے زوال کا سبب بنتی ہیں۔ محمد الیاس نے افسانہ نگاری کے ساتھ ناول نگاری بھی کی ہے لیکن زیادہ شہرت افسانوں کی وجہ سے حاصل کی۔ ان کے افسانوی مجموعے ''لوح ازل پہ لکھی کہانیاں''، ''مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''، ''صدیوں پر محیط ایک سفر''، ''منظر پس غبار''، ''دوزخ میں اک پہر''، ''آہینے میں گم عکس''، گلیوں بازاروں ہیں۔ مجوزہ موضوع میں ان کے چار افسانوی مجموعوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ:

کوئی بھی معاشرہ تنزلی کی طرف اُس وقت جاتا ہے جب اُس کے اندر غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی عادات جنم لیتی ہیں۔ محمد الیاس نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے اور

سماج میں پائے جانے والے مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ ان کے ہاں کس قسم کے مسائل کا تذکرہ ہے اور معاشرے کے کون سے پہلوؤں سے اُٹھایا گیا ہے۔ نیز وہ کونسی غیر اخلاقی صورتیں ہیں جو کہ اخلاقی زوال کا سبب بنیں۔ اُن کو اُجاگر کرنے سے قاری پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۳۔ مقاصد تحقیق:

مجوزہ موضوع ''محمد الیاس کے افسانوں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کا تجزیاتی مطالعہ'' کے تحقیق کے درج ذیل مقاصد ہیں۔

۱۔ سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے مختلف ناقدین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا۔

۲۔ محمد الیاس کے افسانوں میں اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں کا جائزہ لینا۔

۳۔ دو دہائیوں میں اخلاقی زوال، مختلف صورتوں میں تبدیلیوں کی وجوہات سے آگاہ ہونا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ سماجی حقیقت نگاری سے کیا مراد ہے ؟ مختلف افسانہ نگاروں کی اس حوالے سے کیا رائے ہے؟

۲۔ محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کو کیسے برتا گیا اور اس کی مختلف صورتیں کونسی ہیں؟

۳۔ ۹۰ کی دہائی اور اکیسویں صدی کے منظر نامے میں اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں میں کیا تبدیلیاں آئیں۔ ان کی وجوہات کا جائزہ لینا۔

۵۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی موضوع محمد الیاس کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کی صورتوں کے پیشِ نظر محمد الیاس کے چار افسانوی مجموعوں ''لوحِ ازل پر لکھی کہانیاں''، ''مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''، ''منظر پسِ غبار''، ''دوزخ میں اِک پہر'' کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

نیز تحقیقی مقالے میں مواد کا تجزیاتی مطالعہ سماجی حقیقت نگاری کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سماجی حقیقت نگاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسے واقعات کا بیان کہ جو تلخ اور کڑوے ہوں اور اُن میں مبالغہ نہ ہو۔ بقول عزیز احمد:

> ''سب سے پہلے وہ ناظر ہے اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی نقاشی کرے وہ کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کچھ نہیں چھپاتا..... زندگی سے وہ جتنا قریب ہو سکے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہے''(۱)

لہٰذا دیکھا گیا ہے کہ مصنّف نے اِن چاروں افسانوی مجموعوں میں سماجی حقیقت نگاری کی یہ پیش کش کیسے کی ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیر نظر مقالے میں ''لوحِ ازل پر لکھی کہانیاں''، ''مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''، ''منظر پس غبار''، ''دوزخ میں اک پہر'' از محمد الیاس پر انحصار کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات کو بذریعہ ڈاک حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تنقیدی کتب، رسائل اور انٹرویوز سے مدد لی گئی ہے۔ تنقید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

اُردو افسانوں میں منفرد موضوعات پر تو بہت کام ہو چکا ہے۔ لیکن محمد الیاس کے افسانوں پر اس موضوع پر اس سے قبل کوئی بھی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کا ایک الگ موضوع ہے۔ اس لیے مجوزہ تحقیق اپنے تناظر میں ایک مختلف و منفرد کام ہے اور میرا مجوزہ موضوع ادبی سطح پر تحقیق کا حامل ہے۔

۸۔ تحدید:

مجوزہ موضوع میں چار افسانوی مجموعے بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جو کہ محمد الیاس کے افسانوی مجموعے ''لوحِ ازل پر لکھی کہانیاں''، ''مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''، ''منظر بس غبار''، ''دوزخ میں اک پہر''ہیں۔ ان چاروں مجموعوں میں سماجی زوال کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ اس لیے زیر نظر تحقیقی مقالے میں اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ تحقیقی کام انہی چار مجموعوں تک محدود ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

اُردو افسانوں میں اس سے پہلے کئی جہات پہ کام ہو چکا ہے اور سیاسی و سماجی شعور کے حوالے سے لکھا گیا ہے لیکن بالخصوص محمد الیاس کے افسانوں میں اس موضوع پر کوئی کام نہیں کیا گیا۔ مجوزہ موضوع میں منتخب کتب و دیگر ماخذات کے ساتھ ساتھ اُردو افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے کیے گئے کام کو بھی مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

انسان ایک سماجی جانور ہے۔ باہم مل جل کر زندگی گزارنا اور ایک دوسرے سے ربط و تعلق اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہیں۔ یہی ملاپ ایک سماج کو تشکیل دیتا ہے۔ لیکن اسی معاشرے میں رہنے والے لوگوں کی خود غرضی، مفاد پرستی اور بدعنوانی اسے گندا بناتی ہیں۔ محمد الیاس ایک جرات مند مضبوط سماجی حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں لہذا ان کی اس انفرادیت کو لوگوں کے سامنے لانا نیز ان افسانوں میں زوال کی مختلف صورتوں کو سامنے لانا مقصد ہے اور یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔

ب۔ ادب اور سماج کا تعلق:

ادب کیا ہے؟

ادب سے مراد وہ تحریر جو انسان کو تفریح و لذت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک بھی دے۔ تحریک سے مراد یہ ہے کہ جو قاری کو اپنے زمانے کے حالات، واقعات کا شعور بھی دے اور اُس کے اندر کچھ کر دکھانے کا جذبہ بھی پیدا کرے نیز اس کے اندر مثبت سوچ بھی اُجاگر کرے۔

ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معنی و مفہوم میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ جب اسلام کو فروغ ملنا شروع ہوا تو اُس وقت ادب کے لیے تعلیم کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ ایک جگہ ادب سے مراد کتابوں سے لی جانے والی تمام معلومات ہیں۔ جبکہ میتھو آرنلڈ نے ادب کو معلومات کہنے کی بجائے اس کے لیے علم کا لفظ استعمال کیا۔ مولانا صلاح الدین نے ادب کو ایسے ابر گہربار کی مانند قرار دیا ہے کہ جس کے برسنے سے انسان کا تشنہ وجود سیراب ہوتا ہے انور سدید لکھتے ہیں۔

> ”مرورایام کے ساتھ جب زندگی نے ارتقا کے اگلے پڑاؤ کی طرف قدم بڑھایا اور لفظ اپنی مجرد حیثیت میں انسانی جذبات کے زیر و بم کو پوری رعنائی سے گرفت میں نہ لے سکا تو اس کے کئی اور ادبی زاویے ابھر کر سامنے آگئے اور تشبیہ، استعادہ اور علامت نے فروغ حاصل کیا اور یوں انسان کے نازک ترین احساسات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے ادب معرضِ وجود میں آیا ادب کا اساسی تعلق معاشرے کے ساتھ ہے“(۲)

اور معاشرہ وہ جگہ یا سوسائٹی جہاں انسان مل جل کر رہتے ہیں اور ان کے روحانی، جذباتی اور ذہنی خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں سے تشکیل پاتی ہے۔ انسان کو چونکہ سماجی جانور کہا گیا ہے لہٰذا اسے زندگی گزارنے کے لیے دوسرے لوگوں سے مل جل کر رہنا پڑتا ہے چنانچہ ایک دوسرے کے غم، خوشی ، اتار چڑھاؤ اور دیگر معاملات زندگی مین ساتھ دینے کی بناء پر ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے اور یہ لازمی امر ہے کہ اس معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے مزاج، عادات و اطوار اور رویے ایک دوسرے سے منفرد و الگ ہوں مگر ان کی تہذیب و تمدن، ثقافت، اقدار و روایات ایک دوسرے جیسی ہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا سماج اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ سماج کے بغیر انسان اپنی زندگی کو صحیح طریقے سے نہیں گزار سکتا اور یہ بات بھی سچ ہے کہ انسان کے بغیر بھی معاشرہ وجود نہیں پا سکتا جوں ہی انسان کے خیالات، عادات اور رسم و رواج میں تبدیلی آتی ہے۔ سماج میں بھی یقیناً تبدیلی آتی ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ انسان میں تبدیلی سماج کی تبدیلی کی وجہ بنتی ہے۔ ایک سماج میں تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ مذہب، معیشت اور سیاست۔

ادب اور معاشرے کا تعلق:

ادب کا براہ راست تعلق معاشرے سے ہے۔ کیونکہ ادب معاشرے کی ہی عکاسی کرتا ہے اُس کے دکھ درد، اُس کا سکون، خوشی ہی ادیب کو متاثر کرتا ہے اور اُسے لکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ پھر ادیب تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ تو گویا ادب اور ایک ادیب اپنے اسی معاشرے، اس کے طور اطوار، تہذیب اقدار و روایات کے درمیان بیٹھا لکھ رہا ہو اور وہ کسی اور دنیا کی بات کر رہا ہو جس کا حقیقت کے ساتھ یا پھر انسانی معاشرے یا انسانی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ یہ بات بھی ماننا پڑتی ہے کہ ادیب کی اپنی داخلی کیفیت، جذبات بھی اُس کی تحریر پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر یہ داخلی کیفیت انہی خارجی کیفیات و حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن میں وہ خود زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ گویا انسان، معاشرہ اور زندگی ہی ادب کے تخلیق کی وجہ ہیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے راجہ شکیل انجم لکھتے ہیں:

> ''جب آدمی کو تخلیق کیا گیا تو ادب اور زندگی ساتھ ساتھ تھے۔ گویا ادب زندگی ہے اور زندگی ہی ادب۔۔ کیوں کہ ہر تخلیق زندگی کی علامت ہے اور زندگی ہی در حقیقت تخلیق ہے''(۳)

ادب کو اگر جذبات کی تخلیق کہا جاتا ہے تو یہ وہی جذبات واحساسات ہیں جو اس معاشرے اور اس معاشرے میں رہنے والے انسان کے ہیں۔ بقول اختر حسین رائے پوری:

> ''انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے۔ سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرنا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے، آرٹ جذبات کو بناتا، سنوارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے''(۴)

انسان کا ہر جذبہ اُس کے ماحول سے جڑا ہوتا ہے اس ماحول میں کبھی موسم اس کے جذبے کو متاثر کرتا ہے تو کبھی اُس کی زندگی کے مسائل اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں یہ مختلف جذبے ادیب کو بھی متاثر کرتے ہیں تو گویا ایک ادیب اپنی تحریروں میں انسان کے اجتماعی جذبات کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے۔ کسی بھی

معاشرے کے اندر دولت کی فراوانی سے وہاں کی خوشوں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور پھر کسی معاشرے کا مقدر اگر مفلسی ہے تو اُس مفلسی کے آثار بھی ادب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنوی معاشرے کی رنگین مزاجی اور عیش و عشرت بھی دکھائی گئی ہے اور اس کے زوال کی صورت میں نظیر اکبر آبادی مفلسی کے کئی رنگ بھی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ان تحریروں سے ماضی کا تو پتہ چلتا ہے تا کہ اگلے لوگ عبرت حاصل کریں مگر حال میں ہونے والے واقعات میں بھی لوگوں کو ان کے اعمال ناموں کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ کیونکہ حالات نزع میں گرفتار معاشرہ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے اسی طرح داد اور صلہ ملے جس کا وہ روادار ہوتا ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کا ادب بھی صحت مند ہو گا اور بیمار معاشرے کا ادب بھی بیمار ادب کہلائے گا۔ دنیا کے دیگر ادیبوں کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیبوں نے بھی اپنے ملک میں ہونے والی تبدیلیوں اور حالات کے بارے میں لکھ کر لوگوں کو آگاہ کیا۔ انگریز کے یہاں آجانے سے لے کر قیام پاکستان، ہجرت اور پھر پاکستان بننے کے بعد کی تمام صورتحال ایک ادیب ہی کے قلم کا موضوع بنے۔ غرض ادب کی ہر صنف میں اپنے عہد کے حالات و واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اردو ادب میں پہلے جب داستانوں کا دور تھا تو بظاہر تو اس میں بیان کی جانے والی دنیا کا تعلق حقیقی دنیا سے نہیں لگتا تھا مگر ان میں بھی حسن سے محبت، نیکی سے محبت، بدی سے نفرت لڑائی کے ذریعے فتح و کامرانی کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ گویا ان داستانوں کو بھی ہم معاشرے سے قطع تعلق کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر اسی طرح اُردو شاعری میں بھی لب و کمر اور رخسار کی یا پھر گل و بلبل کی بات کی گئی مگر حقیقت میں یہ ساری چیزیں بھی دنیا کے حسن اُس میں پائی جانے والی خوبصورتی کا اظہار ہے۔ گویا ہر دور کا اب زندگی اور معاشرے کا ہی ترجمان رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف تقی:

> ”ادب اور زندگی کا رشتہ اتنا گہرا، اتنا مستحکم اور اتنا ہمہ گیر ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ محسوس یا غیر محسوس طریقے سے زندگی کا پرتو ادب پر اور ادب کے سائے زندگی پر ضرور پڑتے ہیں اور چونکہ زندگی اپنے نامیاتی سفر میں کتنی قدروں کو توڑتی، جوڑتی اور جنم دیتی آگئے بڑھتی رہی ہے اس لیے ادبی اقدار میں تغیر ناگزیر ہے اور پھر جس زبان کے ادب میں یہ خصوصیت نہیں کہ وہ ہر پل بدلتی ہوئی قدروں کی نمائندگی کر سکے اس کی مثال اس بے برگ و بار پیڑ کی طرح ہے جو اپنے وجود سے نہ ہی ذوقِ بصارت کے لئے تسکین کا سامان فراہم کر سکتا

ہے اور نہ ہی سایہ فگن ہو کر راحت پہنچا سکتا ہے"(۵)

پھر اس طرح اس ادب کے ذریعے ایک نسل کے تجربات و مشاہدات کو دوسری نسل تک پہنچانے کا فریضہ بھی ایک ادیب سر انجام دیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے:

"میرے لیے عصری آگہی کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ایک نسل کے تجربہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کا پُل بنتا ہے"(۶)

یہ بات تو واضح ہے کہ معاشرہ ادیب کو متاثر کرتا ہے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ ایک ادیب بھی معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ بعض ایسے ادیب بھی ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کو نہ متاثر کیا ہو مگر آنے والے وقت میں ان کے کام کو لازمی سراہا گیا۔ یعنی ہر دور کا ادیب اپنے دور کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے دور کا نقیب بھی کہلاتا ہے۔ ایک اچھے ادیب کے لیے صرف کہہ دینا ہی کافی نہیں بلکہ وہ کیوں اور کس لیے کہہ رہا ہے، زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ میر تقی میر کے ہاں ہمیں اٹھارویں صدی کے سیاسی انتشار کا عکس بھی ملتا ہے اور میر درد کے ہاں دنیا کی بے ثباتی اور مرنے کی خواہش بھی دراصل اُس دور کی سماجی حالت کی وجہ سے ہی ہے۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقانے لوگوں کو زندگی میں کامیاب ہونے کا درس دیا۔ حالی نے قومی اصلاح کا فریضہ سر انجام دیا۔ حالی نے مسدس "مدوجزر اسلام" لکھی۔ جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے تقابل سے نہ صرف ایک فساد پذیر معاشرے کی تصویر دکھائی بلکہ آئندہ کے لیے بھی طرز عمل کا رُخ متعین کیا اور مایوس دلوں کی ڈھارس بندھائی۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے ناولوں سے معاشرے میں عورت کی اہمیت اس کی تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ اکبر نے مغرب پرستی کے نقصان سے آگاہ کیا۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں خودی، غلامی سے نفرت اور فقر و درویشی کا وہ سبق دیا جس کی اُس وقت بہت ضرورت تھی۔ حصول آزادی کے وقت کی سفاکیت، بربریت اور انسانیت سوز مظالم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا تو انہی ادیبوں نے اپنی تحریروں سے ظالم کو غیرت اور شرم دلائی نیز خونخوار وحشیوں کو آئینے میں ان کا اصلی چہرہ دکھایا۔ یہی نہیں بلکہ ہر دور میں ادیب نے معاشرے پر بیتنے والے واقعات کو قلمبند کیا اور اپنے معاشرے کا نمائندہ بن کر سامنے آیا۔ خاور جمیل لکھتے ہیں:

"ادب برائے ادب کے نظریے کو مہمل سمجھتا ہوں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ

ادب برائے ادب کا نظریہ ادب کو اس کی بنیادی قوت یعنی سماجی عمل سے کاٹ دیتا ہے۔ کوئی ادب سماجی عمل سے کٹ کر، زندگی سے دور ہو کر، انسانی رشتوں سے بے تعلق ہو کر، عوام کو نظر انداز کر کے اور کسی ایک طبقے کے مفاد سے وابستہ ہو کر زندہ تخلیق عمل نہیں بن سکتا"(۷)

ایک ادیب کا معاشرے کے ساتھ روح کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اُس وقت تک اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتا جب تک وہ زمانے کے مصائب و مشکلات کا شعور نہ رکھے جب وہ اپنے اندر شعور پیدا کر لیتا ہے تو وہی اُس کے اندر تخلیق کی روح کو جنم دیتا ہے۔ بقول خاور جمیل "ادب اور زندگی کا یہی رشتہ ہے جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے"۔

ماضی سے لے کر اب تک انسانی زندگی میں مختلف مسائل نے جنم لیا۔ پوری دنیا میں امن و امان کا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ جدید مشینوں کی وجہ سے انسانی زندگی پر جو بُرے اثرات پڑ رہے ہیں خاندانی اکائی کا مسئلہ، جاگیر دارانہ اور قبائلی نظام کے جو مسائل ہیں، غربت اور اس سے پیدا ہونے والی برائیاں قومی تشخص کا مسئلہ، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب ایک ادیب کے مسائل نہیں۔ وہ ان تمام مصائب اور پریشانیوں سے دور رہ کر کوئی الگ قسم کا ادب تخلیق کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا۔۔۔ ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیت اجتماعی، ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اُسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات۔۔۔ اس کے آندر کی دنیا اُس کے باہر کی دنیا سے متاثر ہو کر لکھتی ہے۔ اگر کوئی ادب اپنے ملک کی تازہ ترین حالات و فکریات کا حامل نہیں تو ہم اُسے اچھا ادب نہیں کہہ سکتے"(۸)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جب ہمارے ادب کا براہ راست تعلق زندگی اور معاشرے سے بنتا ہے تو پھر وہ ادب امر ہو جاتا ہے جس کی باقیات رہتی دنیا تک قائم رہتی ہیں اور ہر آنے والی نسل کے لیے وہ ادب ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ بن جاتا ہے۔

پریم چند نے سوز وطن کے دیباچے میں لکھا:

"ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفوں پر ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت"(۹)

ویسے تو ہر دور میں ادب زندگی کا پرتو رہا ہے مگر ادب اور زندگی کا تعلق بطور خاص اُس وقت دیکھنے کو ملتا ہے جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور ہر صنف میں ادب برائے زندگی جھلک نظر آنے لگی۔ لیکن اُردو افسانے میں بطور خاص ادب میں مقصد کو برتا گیا۔ اس سلسلے میں شہزاد منظر لکھتے ہیں:

"آج کا افسانہ روایتی افسانے کی طرح صرف کہانی بیان نہیں کرتا۔ زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست اور زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کا نوحہ بھی پیش کرتا ہے۔ اور جبریت و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتا ہے"(۱۰)

تو ظاہر ہوا کہ ادب میں تاثیر اور طاقت و قوت اُسی وقت پیدا ہو گی اور وہ لوگوں کے دلوں کی آواز بنے گا جب وہ حقیقت کا آہینہ دار ہو گا ورنہ محض تفریح والی چیز صرف وقتی بن کر دی جاتی ہے جس کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں بقول پریم چند:

"اگر بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔۔۔ ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حیثیتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔۔۔۔ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آہینہ دار ہو۔۔۔۔۔ اسے ہماری حیات پر تبصرہ کرنا چاہیے"(۱۱)

غرض ادب زندگی کا جوہر ہے۔ زندگی کا نفع و نقصان ادب کے ساتھ جڑے ہیں۔ ایک ادیب اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور اپنے عہد کے حالات و واقعات سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ جو ادیب، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کو غیر اہم سمجھتے ہوئے ان سے پہلو تہی کی کوشش کرتا ہے۔ نیز ان تمام مسائل سے کٹ جائے تو وہ ادب ناکام اور وہ ادیب نامراد ہے۔

ج۔ اُردو افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کی روایت:

اُردو میں افسانے سے پہلے داستان گوئی کا دور تھا اور فارسی سے اردو میں شہرت حاصل کرنے والی داستان ''باغ و بہار'' اپنی مثال آپ ہے۔ داستان میں ایسی کہانیاں شامل ہوتی تھیں جن کا حقیقی دنیا سے تعلق کم اور خیالی دنیا سے زیادہ تھا۔ یعنی داستانوی کہانیوں میں زمین کی بجائے آسمانی دنیا کا تخیل شامل ہوتا اور جنوں پریوں اور مافوق الفطرت واقعات کا رواج تھا۔ گویا حقیقی زندگی میں انسان اپنی محرومیوں کا آزالہ کرنے کے لئے داستان گھڑتا جس میں آسودگیوں اور محرومیوں کی خواہش کا حصول اس کے لئے آسان ہو جاتا۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

> ''کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلے سے اس کا لگاؤ، اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ تھکے ہارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لئے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی جستجو کی ترقی تھی جو اس کے فطری احساس برتری کو تسکین دے سکے۔''(۱۲)

مگر اس خیالی اور داستانوی دنیا میں بھی انسان جدوجہد کرتا اور مصائب کا سامنا کرتا نظر آتا ہے۔ گویا اس دور میں بھی قدرے کم لیکن اس دور کے سماج کی عکاسی ملتی ہے۔ اردو میں اصل داستان نگاری کا آغاز فورٹ ولیم کالج میں ہوا۔ اور سادہ اور عام فہم انداز میں لکھی جانے والی ''باغ و بہار'' سے ہمیں اس دور کی تہذیب اور ماحول کا پتہ چلتا ہے۔ پھر اسی طرح رجب علی بیگ سرور کی داستان ''فسانہ عجائب'' بھی لکھنوی طرز معاشرت کا پتہ دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دور تھا کہ جب زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کم کیا جاتا ہے اور داستانوں کی خیالی دنیا میں مگن ہو کر اپنی آسودگیوں اور خوشیوں کو ڈھونڈا جاتا۔ اور زوال شدہ عہد میں صرف داستان کی دنیا ہی انھیں پناہ دیتی ۔ انگریزوں نے جب یہاں کے بادشاہوں اور امراء کی نااتفاقی اور آپس کی چپقلش دیکھی تو انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر یہاں قبضہ جمالیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا عذاب بن کر آئی۔ مسلمانوں سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا اور ہر شعبے کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے۔ مفلوک الحالی کی زندگی گزارنا اب مسلمانوں کا مقدر بن چکا تھا۔ لہٰذا اب ان کے سامنے انگریز ہی نہیں ہندوؤں کی

مخالفت بھی تھی جو انگریزوں کے ساتھ مل کر انھیں نیچا دکھانے اور پیچھے دھکیلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ مسلمانوں کو اقتدار چھین جانے کا دکھ تو اپنی جگہ تھا ہی مگر دوسری طرف انہیں سیاسی، سماجی حوالے سے بھی کمتر سمجھا جانے لگا۔ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان اب دونوں قوموں کی نفرت دل میں پال رہے تھے۔ اب مسلمانوں کو تن تنہا ان دونوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

انگریز کا یہاں آنے کا مقصد ایک تو تجارت اور قبضہ تھا اور دوسرا یہاں کے لوگوں کو پکا عیسائی بنانا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جس میں انگریز فوج میں شامل سپاہیوں کو یہاں کے کلچر اور زبان سے متعارف کروانا تھا۔ مسلمان انگریز قوم سے متنفر ہونے کی وجہ سے ان کی زبان اور ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں سے اپنی اولادوں کو دور رکھنے میں ہی عافیت محسوس کرنے لگے۔ مگر سر سید احمد خان نے انھیں ان کی زبان اور جدید تعلیم سے دور رہنے کی بجائے ان سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جس کے لئے انھوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا۔ اس کالج میں مغربی تعلیم کی جدید علوم کی کتابیں بڑی تعداد میں ترجمہ کی گئیں تاکہ ہندوستانی جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ لہذا اس کالج میں پہلی بار خیالی کہانیوں سے انحراف کرتے ہوئے ماضی کی بجائے حال اور مستقبل کی طرف پیش قدمی کی گئی اور یوں ادب میں مقصدیت کی جھلک بھی نظر آنے لگی۔ سر سید کی اس تحریک میں حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد شامل تھے۔ جنہوں نے اردو نثر کے لئے نئی راہیں متعین کیں اس کالج نے اردو ادب پر بہت دور رس اثرات مرتب کیئے۔ مگر اس کالج میں فلسفہ اور منطق جیسی بھاری اور ضخیم کتابیں جن میں عقل کو بنیادی حیثیت دی گئی لوگوں کی بوریت کا باعث بنیں اور لوگ جلد ہی ان سے متنفر ہونے لگے۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> ”سر سید نے اصلاح کے جوش میں ادب کے جمالیاتی زاویوں کو نظر انداز کر دیا۔ مقصدیت کی شدت نے ادب پارے کو تبلیغی بنا دیا۔ فکری سطح پر تحریک کی حد سے زیادہ مغرب زدگی اور جدیدیت ایک بڑی خامی شمار ہوئی۔ جس کا رد عمل ”اودھ پنچ“ اور اکبر کی صورت میں ہوا اور طنز و مزاح کے پردے میں تحریک کے کمزور پہلوؤں پر سخت نکتہ چینی شروع ہوئی“(۱۳)

سیر سیّد کی اسی متانت اور مقصدیت کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"سر سیّد نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اُردو نثر کی جس روایت کو فروغ دیا تھا اُس میں متانت اور سنجیدگی زیادہ تھی اور خیال کی روحانی مہک مفقود تھی۔ چنانچہ اس قسم کی نثر کے خلاف رد عمل شروع ہوا تو چند ادباء سامنے آئے جنہوں نے حقیقت کو دلاویز اسلوب میں پیش کرنے میں دلچسپی لی"(۱۴)

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی سماجی تعلیمی اور سیاسی فضا بالکل بدل گئی تھی۔ نئے علوم کی آمد، نئے نظریات جیسا کہ ہر چیز پر عقل کی برتری اور غور و فکر کرنے کا عمل رواج پا رہا تھا۔ مشینوں کی آمد سے زندگی اب تیزی کی طرف گامزن تھی۔ لہٰذا فراغت کا وہ دور جس میں بیٹھ کر خیالی دنیا کی داستانیں لکھی اور سُنی جاتی تھیں اب وہ دور ختم ہو گیا تھا۔ پریس کی ایجاد سے صحافت کی دنیا میں ترقی ہوتی چلی گئی اور اخبارات، رسائل و جرائد کا سلسلہ چل نکلا۔ سیاسی سطح پر دیکھا جائے تو ہندی کو عدالتی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ صوبہ بنگال کی منسوخی، کانگرس کی جانبدارانہ پالیسی وغیرہ، یہ وہ تمام حالات تھے جنہوں نے مسلمانوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اُردو ادب پر نظر دوڑائیں تو بیسویں صدی کے ساتھ ہی دو الگ رویے دیکھنے کو ملتے ہیں ایک رومانویت کا روّیہ اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانویت کی ابتدا یلدرم سے ہوئی اور افسانے میں حقیقت نگاری کا آغاز پریم چند نے کیا۔

افسانے کی تعریف:

"لغت کے اعتبار سے افسانہ، چھوٹی کہانی کو کہتے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں ایک سچی اور حقیقی کہانی کو افسانہ کہا جاتا ہے جس میں کسی ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر کہانی کی تشکیل کی گئی ہو۔ جس میں وحدت تاثر ہو۔ افسانہ زندگی کا ایک جز پیش کرتا ہے"(۱۵)

فرصت کے لمحات میں پڑھی جانے والی داستانوں کے بعد اور زندگی کی تیز رفتاری کی طرف گامزن انسان نے اب لمبی اور غیر حقیقی داستان سے دامن چھڑا کر چھوٹی اور دلچسپ کہانی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جس میں کہانی سننے اور لکھنے کے مزاج میں تبدیلی ہوئی۔ رومانویت سر سید کی عقلیت پسندی کے رد عمل کے طور پر آئی۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

"رومانویت کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف تو نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ ایک پہلو دار

اصطلاح ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ رومانویت، کلاسیکیت کے خلاف رد عمل کا نام ہے۔ ضابطوں، پابندیوں اور قواعد و قوانین کی جکڑ بندیوں کے خلاف بغاوت، اعتقادات، روایات اور معیارات کی مروّج قیود سے آزادی اور انفرادیت، تخیل اور جذبات کی طرف سفر رومانیت کے بنیادی خصائص ہیں"(۱۶)

رومانیت کی یہ تحریک فرانس میں پھر انگلستان اور پھر پورے یورپ میں پھیلی اور آہستہ آہستہ ہندوستان کا رخ کیا اور سجاد حیدر یلدرم نے "خارستان و گلستان لکھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ یلدرم کی تقلید میں کئی اور رومانویت پسند افسانہ نگار سامنے آئے۔ ان میں نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی، لطیف احمد، مسز عبد القادر، مجنوں گھورکھپوری، اور قاضی عبد الغفار قابل ذکر ہیں۔ ان کے ہاں حسن، رنگینی، جمال، ذوق، جذبہ، محبت اور منظر ان تمام چیزوں کا احساس ملتا ہے۔ سیاسی، معاشی جبر، پابندیاں، ان حالات سے بغاوت اور دلی و ذہنی سکون انسان کا بنیادی مسئلہ تھا جس کے لیے ہمیں رومانوی انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے عقل پر جذبات کی برتری اور حقیقت کی بجائے تخلیت پر رومانویت کی بنیاد رکھی جہاں زندگی کے مسائل و مشکلات کی بجائے زندگی کے حسین پہلو، محبت حسن و عشق کو زیادہ ترجیح دی گئی۔ ان کے نزدیک ایک ادیب مصلح نہیں ہوتا۔ زندگی کیا ہے! اس کے مسائل کیا ہیں؟ ادب کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ معاشرتی مسائل کو براہ راست موضوع بنانے کی بجائے ان مسائل سے پیدا ہونے والے فرد کے داخلی مسائل کو اپنا موضوع بناتے تھے۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

"ان کے نزدیک درونِ ذات کے نفی مطالبات اور فطری داعیات کا حسین اظہار یہی فن کی معراج تھا۔ وہ فنکار و مصلح میں فرق سمجھتے تھے اور معاشرتی مسائل کو بلاواسطہ موضوع بنانے کی بجائے ان مسائل سے پیدا شدہ تضادات کے پہلوؤں کو جو فرد کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوئے ہیں، اپنا موضوع بناتے تھے"(۱۷)

رومانوی نثر کا ایک نمونہ:

"اگر میں صحرا نشین ہوتا تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔

اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسسیات محسوس کرتا"(۱۸)

اس تمام صورت حال میں حقیقت نگاری کا رجحان سامنے آیا۔ حقیقت نگاری ایک طرف تو رومانیت کا رد عمل تھی لیکن یہ دونوں رویے ایک ساتھ بھی چلتے رہے حقیقت نگاری جس کا مقصد زندگی کے مشکلات و مسائل کو بغیر کسی ہچکچاہٹ سے بیان کرنا تھا۔ جس کے سامنے بیمار و کمزور معاشرے کے مسائل، اور تکالیف تھیں۔

حقیقت نگاری کیا ہے؟

یہ ادب اور مصوری کی ایک اصطلاح ہے۔ انگریزی میں اسے Realism کہتے ہیں اور اُردو میں اس کا مطلب حقیقت نگاری ہے۔ یورپ میں یہ انیسویں صدی کے آخر میں استعمال ہونے لگی اور بیسویں صدی میں جرمنی، روس، فرانس اور انگلستان کے ادیبوں نے رومانوی تحریروں کے خلاف آواز اٹھائی اور ردِّ عمل کے طور پر وہاں بھی دیہاتی و شہری کی حقیقی زندگی کی تصویر کشی ہونے لگی۔

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

"جلد ہی یہ تحریک اشراکیت سے متاثر ہوئی اور حقیقت نگاری نے ترقی پسندی کا غلاف اوڑھ لیا اور ادب میں شہری و دیہاتی زندگی کی سچی تصویر کشی میں "انقلاب آفرینی" کے عناصر شامل ہوگئے گویا ترقی پسندی میں حقیقت نگاری شامل ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ حقیقت نگاری کی ابتدائی شکل ہے اُردو فکشن میں پریم چند کو اوّلین حقیقت نگار اور ترقی پسند کہا جاتا ہے"۔(۱۹)

حقیقت نگاری کی تحریک رومانیت سے بالکل برعکس ہے کیونکہ حقیقت نگاری میں تخلیت اور تصوریت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بقول عزیز احمد:

"حقیقت نگاری تصوریت سے ہمیشہ گھبراتی ہے وہ بھی زندگی کے گہرے سچے اصول کی متلاشی ہے مگر اس کا راستہ دوسرا ہے۔"(۲۰)

ایک حقیقت نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ جو بھی واقعہ بیان کرے اُس میں اُس کی اپنی مرضی، پسند اپنا نقطہ نظر یا انتخاب شامل نہ ہو۔ نہ وہ اس میں کانٹ چھانٹ یا کمی پیشی کر سکتا ہے، نہ وہ کچھ چھپاتا ہے اور نہ ہی دوسروں سے پوشیدہ رکھنا اُس کا مقصد ہے بلکہ جو جس طرح ہے وہ اُسی صداقت اور سچائی سے اُس کو اُسی طرح بیان کرے۔ بقول ڈاکٹر شفیق انجم:

> ''حقیقت نگاری کا کڑا معیار فوٹو گرافی کے مترادف ہے۔ حقیقت نگار فوٹو گرافر کی طرح اپنی مرضی اور ذاتی پسند و ناپسند سے قطع نظر کو فوکس کرتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں جو چیزیں جس انداز اور جس ترتیب میں ہے اسی انداز اور ترتیب سے پیش کر دیتا ہے۔ اسے اضافے اور کانٹ چھانٹ کا اختیار نہیں۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کی سچی اور ملمع کاری سے پاک تصویر کشی، جس میں ذاتی تاثیر اور تخیل کو دخل نہ ہو، حقیقت نگاری ہے۔''(۲۱)

حقیقت نگاری اور رومانیت میں یہی فرق ہے کہ رومانیت میں ذاتی نقطہ نظر اور تخیل کار فرما نظر آتا ہے جبکہ حقیقت نگاری میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں ماضی کے حسین خوابوں کی بجائے حال کے موجودہ حالات و واقعات کو من و عن دکھایا جاتا ہے۔ جو تلخ بھی ہوتے ہیں اور کڑوے بھی نیز اس میں مبالغہ آمیزی بھی شامل نہیں ہوتی۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''حقیقت نگار جتنا ہی باکمال ہو گا اتنا اس کا نقطہ نظر غیر شخصی ہو گا۔ سب سے پہلے وہ ناظر ہے اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی نقاشی کرے وہ کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کچھ نہیں چھپاتا۔ نظریاتی طور پر وہ انتخاب یا تراش خراش کے اصول کا پابند نہیں۔ غیر متعلق تفصیلات کو البتہ وہ کم کر سکتا ہے۔ اس کا انداز بیان بہت صاف سیدھا ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب اس کے موضوع سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی رائے کا بہت کم اظہار کرتا ہے۔ روایت کا وہ پابند نہیں۔ واقعی زندگی سے وہ جتنا قریب ہو سکے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہے۔''(۲۲)

ایک بات تو طے ہے کہ بے شک ایک حقیقت نگار واقعات کو پوری سچائی سے اُسی طرح بیان کرتا ہے جس طرح وہ ہوئی ہے۔ مگر اس میں اُس فنکار کا اپنا فن، قابلیت اور اُس کی فنکارانہ تخلیق اُسے مزید پختہ کر کے اُس میں نکھار پیدا کر دیتی ہے۔ بقول ممتاز شیریں:

> ''حقیقت نگاری کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ سامنے سے گزر رہا ہو، اُسے من و عن بیان کر دیں، خواہ یہ روکھی پھیکی رپورٹیج کیوں نہ بن جائے۔ رپورٹیج اور فن میں یہ فرق ہے کہ فنکارانہ چیز کی تخلیق میں واقعات کا چناؤ، ترتیب اور انداز بیان کو بڑا دخل حاصل ہے''(۲۳)

چنانچہ حقیقت نگاری سے مراد اشیاء کو، اشخاص کو اور کسی واقعے کو کسی بھی قسم کے تعصب اور رومانیت کے بغیر پوری دیانت اور سچائی سے پیش کرنا ہے اور خیالی دُنیا کی بجائے حقیقی دنیا کو موضوع بنانا، یعنی کسی بھی چیز یا واقعہ کو بغیر رنگ و روغن چڑھائے اس کی اپنی اصلی شکل و صورت کے ساتھ پیش کرنا، حقیقت نگاری کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ادیب اپنی ذات کو ادب پارے میں نمایاں کرنے سے اجتناب کرتا ہے، وہ زندگی کے ایسے کراہت انگیز مظاہرات کو موضوع بناتا ہے جن کا وجود مسلم ہوتا ہے وہ زندگی کو رنگین شیشوں سے دیکھنے کی بجائے عینک اُتار کر ننگی آنکھ سے دیکھتا ہے اور سماج میں پائے جانے والی نقص و عیب کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا حقیقت نگاروں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ٹھوس اور حقیقی زندگی سے اپنے قلم کا رشتہ جوڑا۔ رومانیت زندگی سے فراریت اور تخیل کی دنیا میں گم ہو جانا تھا۔ حقیقت نگاری نے ان خیالی دنیاؤں کو خیر آباد کہا اور حقیقی زندگی کی تلخیوں اور سچائیوں کے ساتھ اُسے قبول کیا۔

ہندوستان میں حقیقت نگاری کا رجحان اپنے پیچھے ایک پورا منظر نامہ لیے ہوئے ہے۔ انگریز جب برصغیر میں اپنی چالوں میں کامیاب ہو گئے تو یہاں آنے کے بعد انہوں نے تجارت کے سارے حقوق مقامی لوگوں سے لینا شروع کر دیے۔ انہوں نے آتے ہی کاروباری لحاظ سے اور صنعتی لحاظ سے ہندوستانیوں کو اپاہج بنا کر رکھ دیا۔ یہاں سے لوٹ لوٹ کر انگلستان بھیج کر وہاں کی منڈیوں کو طاقتور بنایا گیا۔ یہاں کی صنعتوں کو تباہ کرنے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر شمیمہ بیگم:

> ''ادھر بنگال کی لوٹ جو انگلستان پہنچی، وہ نہ تو بیکار پڑی رہی اور نہ زمین میں دفن کر دی

گئی بلکہ اس دولت سے وہاں بڑے بڑے کارخانے کھولے گئے اور وہاں وہ انقلاب آیا جس کو دنیا کی تاریخ میں صنعتی انقلاب کہتے ہیں"(۲۴)

جب یہاں کی مخلوق کو نو آبادیوں نے بے بس کر دیا۔ تو بدلے میں انگریز حکومت سے نفرت اور کمزور اور مظلوم عوام کی ۱۸۰۷ء کی جنگ آزادی غالباً ظلم کے خلاف ایک کوشش تھی۔ اس جنگ آزادی میں ناکامی نے مسلمانوں کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو گئے۔ انگریزوں نے یہاں قیام کرنے کے بعد اپنی تعلیم تہذیب و ثقافت کو ایک پالیسی کے تحت یہاں عوام کی زندگیوں پر مسلط کرنا شروع کر دیا، ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ایک طرف مسلمانوں کو تباہی سے ہمکنار کیا تو دوسری جانب انہیں خوابوں اور بے عملی کی زندگی سے نکال کر حقائق سے نبرد آزما ہونے کا احساس بھی دلایا"(۲۵)

مسلمانوں کو اس بے عملی سے عمل کی طرف لانے کی پہلی کوشش سر سید احمد خان نے کی مگر اُن کی یہ کوشش اپنے آندر مقصدیت اور روکھا پن لیے ہوئے تھی۔ اور رومانیت زدہ ادب میں کھو جانے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے حالات ساز گار نہ تھے۔ انہی حالات میں پریم چند ایک ایسے افسانہ نگار کے طور پر اُبھرے جنہوں نے ہندوستانی سماج کے دکھوں اور تکلیفوں کو پہلی بار اُردو افسانے میں سمویا۔

چونکہ اپنے گرد و پیش کے مسائل کا شعور رکھنے والا ادیب ان مسائل سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا شعور رکھتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے افسانوں میں کیا۔ بقول محمد افضال بٹ:

"انہوں نے ان مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنالیا۔ ان کے دل میں مشرقی آداب و روایات کا احساس بدرجہ اتم موجود تھا، وہ معاشرتی ناہمواریوں، سماجی ناانصافیوں، معاشی بدحالی اور سیاسی چیرہ دستیوں سے روحانی کرب کا شکار ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روحانی کرب کو دور کرنے کے لیے، ماحول اور سماج کو مفسدات سے نجات دلانے کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنے کی روش کو ترجیح دی۔ جس میں حقیقت پسندانہ

شعور جھلکتا ہو۔"(۲۶)

اپنے دور کے استحصالی نظام میں سسکتے بلکتے انسانوں کے ساتھ پریم چند کا رشتہ ہمدردی کا رشتہ تھا۔ ان کا ابتدائی افسانہ "سوز وطن" میں وطن کی محبت بھی ہے اور ملکی غیرت و حمیت کا عکس بھی موجود ہے۔ اس میں حقیقت اور صداقت کا رنگ ملتا ہے۔ ان کا تعلق خود ایک غریب گھرانے سے تھا کچھ تو اپنے زندگی کے تلخ تجربات تھے اور مزید ہندوستان کے حالات، بیسویں صدی کے شروع میں کسان اور مزدور مشکل کا شکار تھے۔ چھوٹا طبقہ مقروض رہنے لگا۔ اعلیٰ طبقہ مفاہمت کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھا زمیندار اور تاجر بھی انگریز حکومت کے وفادار رہنے کا ناٹک کر رہے تھے، غرض یہ کہ غریب اور مجبور طبقہ کسانوں کا تھا جو معاشی لحاظ سے پریشانیوں میں گھر چلے تھے۔ عورتوں کی مظلومی اور لاچارگی، ہندو مسلم فسادات بھی مسائل کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے۔ گھریلو حالات اور گرد و پیش کے حالات نے پریم چند کو اظہار کا شعور عطا کیا۔ انہوں نے سرمایہ داروں کا منافقانہ چہرہ لوگوں کے سامنے لایا۔ جو غریبوں کی زندگی کا دائرہ تنگ کیے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں کرب بھی ہے اور دکھ بھی "محمد افضال لکھتے ہیں۔

> "پریم چند نے قلم کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ معاشرے کی ہر برائی کو مٹانے کا عزم کیا۔۔۔ ادب کے ذریعے شعوری طور پر عوام کے مسائل کو سمجھنے اور انسان دوستی کی طرف قدم بڑھایا"(۲۷)

پریم چند نے اپنے آخری دور میں افسانے کا مقصد صرف کہانی بیان کرنے تک محدود نہ رکھا بلکہ اب وہ حقائق کو بے نقاب کرنے کے لیے افسانے کا میڈیم استعمال کرنے لگے تھے۔ انہوں نے افسانوں میں انسان کی امنگوں، ناکامیوں اور مجبوریوں کو موضوع بنایا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> "انہوں نے دیہات کو دیہات کی کوکھ سے تلاش کیا، سیاست کی سیاہ کاری کو اس کے باطن سے دریافت کیا۔ ان کے کردار اپنی زندگی خیر و شر کے سنگم پر بسر کرتے ہیں اور اس کے تموج کو سامنے لاتے ہیں۔ جو حقیقی زندگی میں موجود ہے"۔(۲۸)

معاشرتی اونچ نیچ، استحصال زدہ طبقہ، مذہب کے نام پر عداوت، نیا سرمایہ دارانہ نظام اس ماحول اور انہی واقعات کا اثر ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ جہاں معاشی، سیاسی اور مذہبی قدغن کے

بدولت نا انصافیاں بڑھ رہی تھیں ظلم و جبر کا بازار گرم تھا۔ وہ لوگ جو پہلے ایک ساتھ تھے اب برطانوی سامراج کی آمد کے بعد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ منافقوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ چنانچہ اُس دور کی یہ وہ حقیقتیں تھیں جن کا پول پریم چند نے اپنے افسانوں میں کھولا۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے برطانوی استداد کو تیز روشنی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جب کہیں ان کے ہاں زمیندار اور کسان کا تصادم ہوا ہے تو ان کی ہمدردیاں کسان کے ساتھ رہی ہیں۔ جب ہوکار اور کسان کی کش مکش رہی ہے تو وہ کسان کے ساتھ رہے ہیں۔ برہمن نے جب غریب دیہاتی کو لوٹنا چاہا تو انہوں نے دیہاتی کا ساتھ دیا ہے۔ جب سرمایہ دار اور مزدور کا مقابلہ ہوا تو وہ مزدور کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ حاکم اور محکوم کے جھگڑے میں وہ اپنی ساری دماغی اور جذباتی طاقت کے ساتھ محکوم کے حقوق کے علمبردار نظر آتے ہیں''۔(۲۹)

ان کے بعض افسانے تو اتنے تلخ ہیں کہ ان میں انسان کی بے بسی اور بے حسی دونوں غالب ہیں۔ ان کا افسانہ ''کفن'' اس کی بہترین مثال ہے۔ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں۔

> ''کفن زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور من کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے''(۳۰)

''کفن'' غربت اور استحصال میں زندگی گزارنے والے انسان کی بے بسی بھی ظاہر کرتا ہے، اور بے رحم معاشرے کی حقیقت کو بھی برہنہ کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان:

> ''پریم چند نے نچلے طبقے کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ افسانہ نگاری کے فن کا پورا احساس کیا اور دونوں کو اپنی متوازن فکر سے مربوط اور ہم آہنگ کر کے ''کفن'' کی تخلیق کی۔ ان کا یہ افسانہ ایک نئے طرز کی بے باکی اور بے رحم حقیقت نگاری کا نمونہ ہے''(۳۱)

یہ افسانہ فرسودہ رسم و رواج سے نفرت، اور سماجی ڈھانچہ کے پرانے نظریات کی بندشوں سے آزادی کا اظہار ہے محنت کرنے والے مزدوروں کے انجام کو مد نظر رکھتے ہوئے گھیسو اور مادھو اب مزید محنت کرنے

سے انکاری ہیں۔ انہیں معاشرے کی بے حسی، بھوک، غریبی اور فاقوں نے اتنا بے رحم بنا دیا کہ ایک مرتے انسان کا بھی احساس ان کے دل سے جاتا رہا۔ اور خود غرضی میں انسانیت کی ہلکی سی دمق بھی ان کے اندر باقی نہ رہی۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے بقول:

> ''ان کے افسانے ''کفن'' کا آخری حصہ انسانی دکھ کی وہ تصویر ہے جسے دیکھ کر پڑھنے والا ان کی شدت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا''(۳۲)

''کفن'' سے اقتباس

> ''گھیسو کھڑا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گئے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں''(۳۳)

ان کی تمام افسانوں کا کمال اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی معاشرتی تصویر سماجی برائی یا اصلاحی جذبہ کے تحت لکھے گئے افسانے ہیں۔ افسانہ ''دو بیل'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ لیکن اس میں اس حقیقت کو عیاں کیا گیا ہے کہ اُس ماحول میں جو سیاسی جبر تھا اُس میں لوگوں کے اندر غلامی کا احساس جنم لے رہا تھا۔ یہاں ظرافت کے باوجود تلخ حقائق چھپتے نہیں بلکہ اور نمایاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''عید گاہ'' طبقاتی تقسیم اور مذہبی تفریق کو ختم کرنے اور برابری اور مساوات کا درس دیتا نظر آتا ہے۔ مجبوری ان کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انہوں نے ہندومت کی اس سماجی برائی پر طنز و تنقید کی ہے جس میں وہ کم عمر لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں۔ اور پھر وہ لڑکی اگر کم عمری میں ہی بیوہ ہو جائے تو اُسے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ عورت ذات کے ساتھ مذہب کے نام پر یہ بہت بڑا ظلم اور شدید قسم کی ناانصافی ہے۔ جس میں بہت سے معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ افسانہ ''دودھ کی قیمت'' میں بھی ہندو تہذیب میں موجود ذات پات اور اونچ نیچ کے نظام کو پیش کیا گیا ہے۔ ایسے معاشرے کی حقیقت عیاں کی ہے جس میں غریب کو مجبور بنا کر ظالم کو ظلم کرنے سے کوئی نہیں روکتا۔ افسانہ ''ڈامل کا قیدی'' مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان موجود کشمکش ظاہر کر رہا ہے۔ پریم

چند انسانیت سے محبت کرنے والا انسان تھا اسی لیے انہوں نے طبقاتی تفریق، بے جوڑ شادیوں، معاشرے میں ظلم، کسانوں کی مشکلات ان کی مجبوریوں کو اپنے افسانوں میں موضوع بنایا اور یہی جذبہ انہیں ترقی پسند تحریک سے جوڑتا ہے۔ اردو افسانے کے آغاز سے انجام تک پریم چند کا نام ایک بڑے ادیب اور مصنف کے طور پر زندہ رہے گا۔ وہ ایک بہت بڑے حقیقت نگار تھے۔ جہنوں نے بے مقصد فن کی بجائے فن کو با مقصد بنانے کا فریضہ سر انجام دیا۔ ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

> ''بے مقصد کہانی ان کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی ۔۔۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کی زندگی اور اس کی سچائیوں کو زمین فراہم کی ہے''(۳۴)

اُردو افسانے میں حقیقت نگاری:

بیسویں صدی تک آتے آتے اُردو افسانہ مختلف تبدیلیوں سے گزار۔ کبھی داستانوں کا رنگ غالب رہا، کبھی مقصدیت غالب رہی تو کبھی اس میں حسن و عشق کا رنگ بھر کر اس کی رونق بڑھادی گئی اور پڑھنے والے کو بھی تفریح اور ذہنی سکون فراہم کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند اور ان کی تقلید میں لکھنے والے کچھ اور لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے اصلاحی مقصد اور سماجی حقیقت کو افسانے میں شامل کیا۔ لیکن یہ کوئی با قاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

> ''اُردو افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت پریم چند ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں پریم چند کے مسلسل لکھتے رہنے کے باوجود اُردو ادب میں رومانی افسانہ نگاروں ہی کا دور دورہ تھا۔ حقیقت نگاری کے فروغ کا زمانہ صحیح معنوں میں ''انگارے'' کی اشاعت اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے''(۳۵)

بیسویں صدی تغیّر و تبدّل کی صدی تھی۔ جس میں بہت سارے اہم واقعات نے جنم لیا۔ پہلی جنگ عظیم ہوئی جس میں ظلم و سفاکی نے انسان کے وجود کو بہت کم اہم بنادیا۔ صنعتی انقلاب کے باعث روس میں ایسا انقلاب آیا جس کی آوازیں ہندوستان تک بھی پہنچیں۔ ہندوستان کی سیاسی صورت حال بھی اب بے یقینی کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اقتصادی و معاشرتی مسائل جنم لے رہے تھے۔ سیاسی رہنماؤں کے حوصلے پست ہو

چکے تھے۔ اشتراکی نظام پوری دنیا میں مقبول ہو رہا تھا۔ اور مارکسزم کے نظریات سے نہ صرف یورپ بلکہ ہندوستان کے نوجوان بھی متاثر ہو رہے تھے۔ استحصال، بھوک و ننگ، ظلم اور ناانصافی جیسی برائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے لوگ عاجز آ گئے تھے۔ اب وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھے جو انہیں سکون دے سکے اور ان کے حالات بدل سکے۔ یہ تمام حالات انسان کو اپنے مذہب اور عقیدے سے خائف کرنے کا ذریعہ بھی بنے۔ بقول ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان:

> ''اب فرد اور جماعت میں بیداری کا احساس، جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا، کئی سماجی تحریکیں شروع ہوئیں، اشتراکیت اور اشتمالیت کے رجحانات ادب میں داخل ہو گئے۔ اب فرد کو اپنی قوم کی پستی کا احساس ہوا۔ بورژوا طبقہ کے لیے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی۔ سیاسی غلامی کا احساس شدید ہو گیا۔ آزادی کی خواہش نے سر اُبھارا۔ اب وہ ہر قیمت پر موجودہ نظام کو بدلنا چاہتے تھے چونکہ ہمارے ادیب بھی انہیں حالات کا شکار تھے لہٰذا اب وہ پہلے سے زیادہ حقیقت اور واقعیت پسند ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ وہ زندگی کو قریب سے دیکھنے لگے تو انہیں پتہ چلا کہ اِن کے ارد گرد کتنا افلاس، کتنی جسمانی و جنسی بھوک، کتنی بے کاری و بے علمی اور کتنی ذہنی بیماریاں بکھری پڑی ہیں۔ مذہب کی آڑے کر مذہب کے علمبردار کیسے بھیانک کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ حقائق اُن کے احساسات پر تازیانے کا کام کر گئے اور انہوں نے اپنے افسانوں میں ان کربناک اور کریہہ المنظر حالات کی سچی تصویریں کھینچنی شروع کر دیں۔ ''انگارے'' بھی انہیں حالات کی پیداوار ہے''(۳۶)

''انگارے'' کے صفحات کی تعداد ۱۳۴ تھی اور اس میں دس افسانے شامل تھے۔ یورپ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں لوٹنے والے نوجوان چونکہ دنیا بھر کے ادب، وقت کے ساتھ اُس میں تبدیلی اور اُس کے اثرات سے آشنا تھے۔ لہٰذا یہاں بھی وہ اسی طرح کا ادب رائج کر کے انقلاب لانا چاہتے تھے۔ لہٰذا ''انگارے'' انہی باتوں کو مدنظر رکھ کر شائع کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

> ''انگارے'' ان چند نوجوانوں کی تخلیقات کا مجموعہ تھا جنہوں نے یورپ میں رہ کر نئی زندگی کے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے۔ یورپ سے اُٹھنے والی تحریکوں کو دیکھا تھا۔ ادب کو

پڑھا تھا، لوگوں سے ملے تھے، چنانچہ نئے عہد کی روشنی سے آگاہ تھے"۔(۳۷)

یورپ سے تعلیم یافتہ ان نوجوانوں میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر یہاں کا ادب لوگوں کی سوچ اور حالات تبدیل کرنے کا باعث بن سکتا ہے تو پھر ہمارا ادب کیوں ان فرسودہ خیالات سے جڑا رہے جن کا کوئی مقصد نہیں۔ چنانچہ بے باکی اور جرات کی روایت انہوں نے "انگارے" کی صورت میں ڈالی۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "جہاں پہلے دور کے افسانہ نگار نے آسمانی رفعتوں کو اس طرح اپنایا تھا کہ زندگی کے ارضی پہلو ایک بڑی حد تک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وہاں دوسرے دور کے افسانہ نگار نے زاویہ نگاہ تو وہی اختیار کیا یعنی بلندی پر سے ماحول کو دیکھنے کا زاویہ، تاہم اب اس نے بلندی کو دیکھنے کی بجائے اپنی نظریں جھکالیں اور زمین اور معاشرے کی کروٹوں کو دیکھتا چلا گیا"(۳۸)

چنانچہ اب یہاں کے ادیب نے زمین اور زمین میں بسنے والی مخلوق کے مسائل اور تکالیف سے اپنے قلم کا رشتہ جوڑا، چنانچہ ان سب لوگوں نے آپس کے صلاح مشورے سے "انگارے" کی اشاعت کی انور سدید لکھتے ہیں:

> "انگارے" کے افسانوں میں مشرقی اقدار کے خلاف غم و غصہ کی آگ زیادہ تھی۔۔۔ چنانچہ امیروں کے مقابلے میں غریب، کار خانہ داروں کے مقابلے میں مزدور اور افسروں کے مقابلے میں کلرکوں کو اس افسانے میں زیادہ موضوع بنایا گیا"۔(۳۹)

۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے بعد مختلف ادبی اور سیاسی تحریکیں سر اُٹھانے لگیں۔ جن کا اثر مختلف ممالک پر ہوا۔ اب لوگ فرسودہ خیالات کی جگہ روشن خیالی کے روادار ہو گئے تھے۔ سجاد ظہیر جب آکسفورڈ یونیورسٹی گئے تو وہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یورپ کی روشن خیالی نے انہیں بھی بہت کچھ کرنے اور سوچنے کی طرف راغب کیا۔ ادب میں تبدیلی اور روشن خیالی کا یہ نظریہ کارل مارکس کے نظریات سے جڑا ہوا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مارکس کے نظریے کو واضح کیا جائے۔

کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کا ہمیشہ اختیار کیا۔ اس نے بادشاہی نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ سوشلزم کا نام اٹھارویں صدی میں فرانسیسی انقلاب میں رائج ہوا۔ سوشلزم کے بارے میں تو بہت سارے مفکرین نے لکھا لیکن بطور خاص اس کی واضح تعریف مارکس نے اپنی کتاب ''کمیونسٹ'' میں پیش کی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ ذاتی و شخصی ملکیت و منافع کو ختم کر کے دولت مساویانہ تقسیم کی جائے۔ اس کے خیال میں معاشرے میں دو طبقات موجود ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار اور محنت کش۔ امیر اور غریب کی جنگ میں سرمایہ دار ہر وقت مزدور کا استحصال کرتا ہے۔ جاگیر دار ہاری کا حق تلف کرتا ہے۔ چنانچہ کارل مارکس کے اس نظریے کا اثر دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی پڑا اور دنیا بھر میں ایسا ادب وجود پانے لگا جس میں سماجی شعور، محکوم اور محنت کش طبقے کے جذبات کی بات کی گئی۔ کارل مارکس کے اس نظریے نے دنیا کے بیشتر ادیبوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی تحریروں میں کسانوں، غریبوں کے حق کی بات کرتے ہوئے دولت کی مساویانہ تقسیم اور غیر طبقاتی معاشرے کا پرچار کریں۔ لہٰذا نئے انداز میں محنت کشوں اور مظلوموں کے حق میں تحریریں سامنے آنے لگیں۔ یوں دیکھا جائے تو ۱۹۶۵ء سے ۱۹۴۵ء کی ادبی نسل نے مارکسزم کے زبردست اثرات قبول کیے۔ ہندوستان کی گھٹی ہوئی فضا میں ان نظریات کا اثر انداز ہونا ایک فطری عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان نوجوانوں نے سماج کی فرسودہ رسموں، شکست خوردہ اقدار اور معاشرتی تضادات کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ اُردو ادب میں پریم چند کے بعد ''انگارے'' وہ کتاب تھی جس نے سماجی حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالی اور پھر بعد میں ترقی پسند تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ اور اس تحریک نے نہ صرف بڑے افسانہ نگار پیدا کیے بلکہ حقیقت نگاری کے رجحان کو مستقبل کے افسانہ نگاروں نے بھی قبول کیا۔ ''انگارے'' کو تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ اس میں بغاوت، نڈرپن اور بے باکی تھی۔ بعض افسانہ نگاروں نے مذہبی و اخلاقی پابندیوں کو توڑ کر اور ان سے آزاد ہو کر لکھا۔ بقول عزیز احمد:

> ''یہ سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ تھا اور اس کا مقصد نئی قدروں کی تعمیر سے زیادہ پرانے اصولوں کی تخریب تھا۔''(۴۰)

لیکن اس کتاب سے اُردو ادب میں ایک نئے رجحان اور ایک نئی سوچ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس پر تنقید اور غم و غصے کا اظہار اپنی جگہ، مگر سماج کے اصلی چہروں اور رویوں کو سامنے لانے کا سہرا بھی انہی قلم کاروں کے سر جاتا ہے۔ بقول آل احمد سرور:

''انگارے'' کے ذریعے سے انہوں نے موجودہ سماج کو جلا کر خاک کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اسے ضبط کرنا پڑا، مگر اس کا اثر جو ہم عصر ادب پر پڑا ہے حیرت انگیز ہے۔ اسی کے اثر سے شعلے، محبت اور نفرت، منزل، انوکھی مصیبت، چنگاری، عورت اور اس قسم کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے''(۴۱)

''انگارے''میں شامل ادیبوں نے بڑی جرأت سے سچ کو بھی نمایاں کیا اور لوگوں کی تنقید کا بھی سامنا کیا۔ اس میں شامل افسانہ نگار احمد علی نے دو افسانے لکھے۔ ''بادل نہیں آتے''اور ''مہاوٹوں کی ایک رات''ان افسانوں میں روزمرہ زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ اور بغاوت کا جذبہ بھی موجود ہے۔ ''مہاوٹوں کی ایک رات''ایک ایسا دل سوز افسانہ ہے جس میں ایک غریب اور بے بس ماں کی کہانی کو درد ناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک شکستہ مکان میں غریب عورت اپنے بچوں کو لے کر بیٹھی ہے اور غربت اور امارت کی تفریق کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔ اس کا ایمان کبھی کچے اور کبھی پکے راستوں پر ڈانوں ڈول ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ افسانے میں بنیادی طور پر غربت کے ہاتھوں تنگ معاشرے میں امیر و غریب کی تفریق کو حقیقت نگاری کے ذریعے پیش کیا ہے۔ افسانہ ''مہاوٹوں کی ایک رات''کا اقتباس ملاحظہ ہے۔

''ایک چھوٹے مکان ۲۴ سے ۲۴ فٹ اور اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالاں۔۔۔ چھت کہ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اور اس پر بارش! یااللہ کیا مہاوٹیں۔ اب کہ ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو برسنا ہی نہیں۔ اب تو روک دو! کہاں جائوں؟ کیا کروں؟۔۔۔ سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپتی ہے اور اس پر ایک لحاف اور چار جانیں''(۴۲)

خلیل الرحمٰن اعظمی افسانے ''مہاوٹوں کی ایک رات''کی بابت لکھتے ہیں:

''احمد علی کا افسانہ ''مہاوٹوں کی ایک رات''انقلابی حقیقت نگاری کا نمونہ ہے۔ اس میں مصنف نے مفلسی اور اس کے دردناک نتائج کو سماجی اور معاشرتی مسائل سے منسلک کر کے نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔۔۔ پہلی بار ہمارے افسانہ نگاروں نے اس بند کو توڑنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے سماج کے بہت سے اہم اور پیچیدہ مسائل ابھی تک فن کے حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے۔''(۴۳)

رشید جہاں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں عورت کے لئے آواز اٹھائی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت معاشرتی ناانصافی اور مذہبی ناآگہی کو اہم موضوعات کی حیثیت دی گئی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''سماج میں عورت کے متعلق پہلی بار بعض ایسی پیچیدگیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جسے آگے چل کر بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنا مرکز بنایا۔''(۴۴)

رشید جہاں کا افسانہ ''دلی کی سیر''میں ہندوستاں کی جنسی زندگی کی گھٹن اور پابندیوں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا گیا ہے کہ جس جگہ پر پابندیاں عام ہو جائیں وہاں گھٹن بڑھتی ہے اور موقع ملنے پر وہی گھٹن خرابی اور گناہ کی صورت میں باہر نکلتی ہے۔ اور پھر ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا سد باب مشکل دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے خاتون ہونے کے باوجود اپنے افسانوں میں جرات مندانہ انداز اپنایا ہے۔ خاص طور پر متوسط طبقے کی خواتین کی زندگیوں کے مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ محمود الظفر کا افسانہ ''جواں مردی ''بھی ''انگارے''میں شامل ہے۔ بنیادی طور پر اس افسانے میں اقتصادی محرومی اور نارسائیوں کو پیش کیا گیا ہے مرد کی معاشرے میں مردانگی اور اس کی اجارہ داری کو موضوع بنایا گیا اور اس کی مردانگی عورت کے استحصال تک ہی محدود ہے۔ اسلام میں کہیں بھی عورت کو مرد کا غلام نہیں قرار دیا۔ یہ تو ہمارے معاشرے کے اپنے بنائے ہوئے اصول و قوانین ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ ''انگارے'' کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ اور فعال افسانہ نگار ''سجاد ظہیر'' تھے۔ ان کے پانچ افسانے ''انگارے''میں شائع ہوئے۔ ''اور نیند نہیں آتی''''جنت کی بشارت'' ''دلاری'' ''پھر یہ ہنگامہ'' ''گرمیوں کی ایک رات'' ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ افسانہ ''جنت کی بشارت''میں مذہبی تعلیمات کا پرچار کرنے والوں اور دوغلہ مزاج رکھنے والوں کی ریاکاری کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ ''پھر یہ ہنگامہ''انسان کی مجبوری، کربناکی، دکھ سکھ، موت زندگی کی کہانی آشکار کرتا ہے۔ افسانے کی عبارت ملاحظہ ہو:

> ''قحط میں لوگ بھوکے مرتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان مرد عورت آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، ہڈیاں پسلیاں جھری پڑی ہوئی کھال کو چیر کر معلوم ہوتا ہے باہر نکل پڑ رہی ہیں بھوک کی تکلیف، ہیضہ، قے دست، مکھیاں، موت کوئی لاشوں کو گاڑنے یا

جلانے والا نہیں۔ لاشیں سڑتی ہیں۔ ان میں سے بدبو آنے لگتی ہے۔"(۴۵)

"دلاری" ایک بڑے گھر میں رہنے والی غریب لونڈی کی کہانی ہے۔ بڑے گھر کے امیر زادے اپنی عیاشی کے مزے لوٹنے کے لئے غریب لڑکیوں کے جذبات کو مذاق سمجھ کر وقت گزاری تو کر لیتے ہیں مگر غریبوں کی بیٹیوں کا معاشرے میں جینا محال ہو جاتا ہے۔ گویا اصل حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور ادب کو بامقصد بنانے کی ایک کوشش ہمیں پریم چند کے ہاں نظر آتی ہے۔ مگر سماج کے تلخ حقائق کے بیان کرنے اور دوہرے مزاجوں سے پردہ اٹھانے کے لئے اتنا ہی تلخ لہجہ ضروری تھا۔ لہٰذا "انگارے" کے افسانوں میں پہلی بار ایسے سماج کی خلاف بھرپور مزاحمت کی گئی جس میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کی جارہی تھی۔ معاشرے میں کئی قسم کے طبقات جنم لے رہے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں نچلے اور غریب طبقے کا استحصال رواج پا چکا تھا۔ غربت، غربت کی کوکھ سے جنم لینے والی بیماریوں، منافقت، بدعنوانی، ریاکاری، ناانصافی اور ظلم و جبر جیسے پہلوؤں کو پیش کیا گیا اور سسکتی انسانیت کے رستے زخم کو عریاں کر کے سارے زمانے کو دکھا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> "انگارے" کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔ بوسیدہ عقیدوں، فرسودہ اداروں، سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی و اخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی و انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔ امیروں، حاکموں اور اہل اقتدار کے مقابلے میں زیر دستوں، ناداروں، مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دور کی آمد کا اعلان تھی جب تخلیقی ادب کی بنیاد طبقاتی شعور اور اشتراکی انسانی دوستی پر رکھی جاتی تھی۔"(۴۶)

"انگارے" کی اشاعت سے ملک بھر میں ہنگامے اور احتجاج ہونے لگے۔ اس کا بے باک انداز مذہبی اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اردو کے اخبارات و رسائل میں اس کے خلاف مضامین لکھے گئے۔ اس کو ضبط کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ بے شک کتاب کو تو ضبط کر لیا گیا مگر آج بھی ادب میں حقیقت نگاری کے حوالے سے مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں "انگارے" کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو نہ صرف ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز تھا بلکہ ترقی پسند تحریک اس کا پرتو بھی ہے۔

پریم چند کا کفن گویا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔ اور ''انگارے'' نے فرسودہ رویات کے خلاف بغاوت کی راہ ہموار کی۔ اسی دور میں ایک تیسرا بڑا انقلاب ''ترقی پسند تحریک'' کی صورت میں ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی اس تحریک کا نظریہ بڑا واضح تھا۔ اب اس نے انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کی بات کی۔ اس تحریک کا تعلق کو شروع کرنے والوں کی نظر ایک طرف عالمی منظر نامے پر تھیں اور دوسرے ہندوستان کے حالات پر۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا تو وہاں کے مزدوروں اور محنت کشوں نے بھی انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ ۱۹۳۵ء میں پوری دنیا کے ادیبوں نے ایک کانفرنس کے ذریعے اپنا منشور پیش کیا جو کہ بطور خاص وہاں کے مزدور طبقہ کے لئے تھا۔ کانفرنس میں شامل ہندوستانی طلبا اس منشور سے متاثر ہوئے چنانچہ لنڈن کے ناکنگ ریستوراں میں چند لوگوں کی مشاورت سے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی اس تحریک میں پیش کیے جانے والے منشور میں بھی استحصال زدہ طبقہ کے حقوق کی بات کی گئی۔ اس میں شامل سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر تھے۔ اس اجلاس میں انہوں نے کہا۔

> ''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کے راستے پر لگانے میں مدد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکل کر انہیں عوام کے قریب تر لایا جائے انہیں زندگی اور واقعیت کا آہینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے مالک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے۔''(۴۷)

یہ بات حقیقت ہے کہ انسان کے اندر بغاوت کرنے اور مزاحمت کرنے کا جذبہ اُس کے حالات سے پیدا ہوتا ہے جب ظلم کی انتہا ہو جائے تو انصاف کے لیے آواز اُٹھانا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کے ادب کے اندر اس تحریک کے پس منظر میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی و اقتصادی حالات کار فرما تھے۔ جس ملک میں شروع سے زراعت و تجارت اور دستکاری کو بطور ذریعہ معاش اپنایا گیا ہو وہاں غیر ملکیوں کے آنے سے اگر اُسی ذریعہ معاش کو تباہ کر کے کم قیمت بنا دیا گیا ہو اور لوگوں کی روزی اُن سے چھین لی گئی ہو وہاں کے لوگوں کے اندر غصہ اور مزاحمت کا پیدا ہونا کوئی حیرانی والی بات نہ تھی۔ انگریزوں نے یہاں آنے کے بعد یورپ کی مصنوعات کو یہاں متعارف کروایا اور یہاں کی ہر چیز کو ناکارہ اور گھٹیا قرار دیا۔ لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ جدیدیت کے اس دور میں فرسودہ چیزوں کا استعمال چھوڑ کر ماڈرن چیزوں سے اپنا معیار زندگی بلند کیا جائے۔ صنعتی منڈیاں قائم کرنے کے لیے یہاں کے مالکوں سے جائیدادیں چھین لی گئیں اور ہندوستان میں مختلف طبقے وجود پانے لگے۔ سرمایہ دار، عام ملازم اور مزدور اور کسان سب سے زیادہ استحصال کی زد میں آنے والا طبقہ غریب مزدور کا طبقہ تھا۔ جو محنت کرنے کے باوجود خالی ہاتھ اور خالی پیٹ رہتا۔

اسی طرح ہندوستان کے سیاسی حالات بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں انگریزوں نے یہاں کی ہر چیز کو اپنے ماتحت کر لیا۔ ہندو اپنی چالاکیوں اور دوغلی پالیسیوں کا ہمیشہ چیمپین رہا ہے لہذا وہ انگریز حکومت کے زیادہ قریب نظر آنے لگے اور مسلمان دور ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو مات دے کر انہیں ہر شعبہ ہائے زندگی میں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس ناانصافی، اجارہ داری اور غلط پالیسی والے ماحول کو قبول کرنا مسلمانوں کے لیے آسان نہ تھا۔ افراتفری اور ہلچل کے اس دور میں آزادی کے حصول کے لیے مختلف تحریکوں نے سر اُٹھایا۔ مسلمان قوم سے انگریزوں اور ہندو کی نفرت اپنی جگہ، مگر اب اُن کی زبان اور مذہب کو بھی مٹانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ان تمام حالات اور قدیم اور فرسودہ روایات کو بدل کر جدید دنیا کے ساتھ چلنا ضروری تھا۔ پہلی جنگ عظیم کا منظر نامہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> ”معاش، مذہب اور معاشرت کے اس جھگڑے میں کروڑوں انسان تہہ تیغ ہوئے، اربوں کا سامان جل کر راکھ ہوا اور ہر سطح پر زندگی تہ بالا ہو کر رہ گئی۔ اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھ گئیں، کارخانے بند ہونے سے خام پیداوار کے دام گر گئے اور بیروزگاری

میں اضافہ ہو گیا۔۔۔ صنعتی اجارہ داروں نے جنگ کے اخراجات مزدوروں کی اجرتوں میں کمی، ٹیکسوں میں اضافے اور ملازموں، اہلکاروں اور فوجیوں کی چھانٹی کی صورت میں پورے کرنے شروع کر دیے۔۔۔ ہندوستان میں تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ہجرت اور سول نافرمانی کی تحریکیں سامراجیوں کے خلاف اسی غم وغصے کا اظہار تھیں۔۔۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے محکوم اور استحصال کا شکار قوموں میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ محنت کشوں، کسانوں اور کٹھ پتلی بنے مظلوم طبقوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہونے لگا"(۴۸)

یہی وہ حالات ہیں جن میں پہلے "انگارے" اور پھر ترقی پسند تحریک سامنے آئی۔ ہندوستان میں اس تحریک کی صدارت پریم چند نے کی۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

"لندن میں ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن قائم ہو گئی۔ جس میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، بنگالی ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور پرمور سین گپتا شامل تھے۔ اس انجمن کا نام Indian progressive writers Association رکھا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں سجاد ظہیر ہندوستان لوٹ آئے اور انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کا پہلا اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی زیر صدارت لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بینر کے نیچے ہوا"(۴۹)

ترقی پسند مصنفین کے خیالات اور سوچ کو کافی پذیرائی ملی اور لوگ ان کے اس کارواں میں شامل ہوتے گے۔ کیونکہ انسانیت، اخوت، محبت اور مساوات کو انہوں نے موضوع بنایا تھا جو اس دور کے تنگ آئے انسانوں کے لیے راہ نجات ثابت ہوا۔ اس طرح اس تحریک نے نہ صرف لوگوں کی سوچ کو بلکہ ادب کو بھی ایک نئی سمت عطا کی۔ مظلوم اور استحصال زدہ قوم کے حق میں بولنے کی انہوں نے ایک نئی مثال قائم کی۔ تحریک کا جرأت ضدانہ اظہار اس کے پہلے اعلان نامے میں موجود ہے۔

"ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے انہیں افشاں کریں گئے۔ ہم انجن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبات کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور

بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"(۵۰)

اُردو ادب کی تمام اصناف پر اس تحریک نے اثر ڈالا۔ بالکل اُردو افسانہ بھی خاص طور پر اس تحریک سے متاثر ہوا۔ اس تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب میں چونکہ مقصد کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس لیے اس تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں میں افسانہ نگاروں کی ذہنی پختگی نظر آتی ہے اور یہی پختگی انقلاب کی وجہ بنی۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ لکھتی ہیں:

"افسانوں کی دنیا میں تین زبردست انقلاب آئے۔ پہلا انقلاب افسانوں کا مجموعہ "انگارے" تھا جس نے پرانی روایات کی شکست وریخت میں حصہ لیا۔۔۔ پریم چند کا افسانہ "کفن" جس نے اس روایت پسند فنکار کو ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور تیسرا انقلاب ترقی پسند تحریک" کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ یہ تینوں انقلابات ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء میں رونما ہوئے۔ اس کے بعد تو افسانہ کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔"(۵۱)

چنانچہ اس تحریک نے جبر و استحصال کے خلاف آواز اُٹھا کر انصاف و مساوات پر مبنی معاشرے پر زور دیا۔ اور صرف اصلاح کرنے کی بجائے پورے معاشرے کو بدلنے کی تحریک چلائی۔ بقول شہزاد منظر:

"سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسند افسانے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سماجی حقیقت نگاری خود کو صرف معاشرے کی تنقید تک محدود رکھتی ہے جبکہ ترقی پسند افسانہ قاری کو معاشرے کو بدلنے کے لیے متحرک کرتا ہے ۔۔۔ ترقی پسند افسانہ وہ ہے جو معاشرے کی تنقید کے ساتھ اسے بدلنے کا بھی قائل ہو"۔(۵۲)

اس تحریک کی خامیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر اہم اس کی خصوصیات و خوبیوں کی بات کریں تو اس کی اہمیت اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ ان مصنفین نے مظلوم انسانوں کے منہ میں زبان دی اور انہیں اتنی

طاقت دی کہ وہ بتا سکیں کہ وہ بھی انسان اور اشرف المخلوق کا درجہ رکھتا ہے اور اُس پر ظلم کرنے والے بھی انسانوں کی ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصغر علی انجینئر لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کے نزدیک انسان پٹا ہوا ذلیل کیڑا نہیں، باوقار، حوصلہ مند اور آزاد، بااختیار وجود ہے۔ جسے جاگیر دار، سرمایہ دار معاشرے نے غلام بنا رکھا ہے لیکن وہ اپنے اختیار سے کام لے کر ان استحصالی معاشروں کی کایا پلٹ سکتا ہے۔''(۵۳)

گویا اس تحریک سے وابسطہ مصنفین نے رومانوی مصنفین کی طرح صرف ایک فرد کے خوابوں اور خواہشوں کی بات نہیں کی بلکہ انہوں نے پورے معاشرے میں انقلاب لانے کی کوشش کی جس سے انسان کے انفرادی دُکھ اور مسائل بھی جڑے ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار انسان کی کربناکیوں، ناآسودگیوں، معاشی ناہمواریوں کو موضوع بناتے ہیں۔ اگر معاشرے سے یہ تمام مسائل ختم ہو جائیں تو انہی سے انسان کے انفرادی مسائل بھی ختم ہو سکتے ہیں گویا ترقی پسند تحریک شروع کرنے کا مقصد ملک میں انتشار اور ظلم پھیلانے والے عناصر کا قلع قمع کرنا اور ادب کے ذریعے اُن کی حوصلہ شکنی کرنا تھا۔ جس کی ناانصافی کی وجہ سے جہالت، مفلسی اور غلامی جیسی چیزیں ہمارے ملک کو جکڑے ہوئے ہیں اور انسان آزاد فضا میں سانس لینے اور ایک خوشگوار اور خوشحال زندگی گزارنے کی بجائے گھٹن زدہ رویے پال رہا ہے۔ گویا یہ تحریک لوگوں کے اندر موجود لاوے کو باہر نکالنے کا ایک ذریعہ بنی جس سے لوگوں کا کتھارسیس بھی ممکن ہوا۔ مختصر پیرائے میں ہم اگر اس تحریک کے منشور کو بیان کریں تو اقبال مجید کے بقول وہ کچھ یوں ہے:

> ''ادب صرف حسن کی تخلیق ہی نہیں حقیقت کی تعبیر بھی ہے ادب صرف تخیل کی رنگ سازی ہی نہیں۔ واقعیت کی مینار کاری بھی ہے۔ ادب محض انفرادی دریافت ہی نہیں، سماجی شعور کا عطیہ بھی ہے۔ ادب عافیت کوشی کی مدھم لوری ہی نہیں، احتجاج کا بلند نعرہ بھی ہے''(۵۴)

غرض یہ کہ اس نے اُردو ادب پر چھائی رومانی فضا کو کم کیا اور اُسے اصل زندگی کا آئینہ قرار دیا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''ترقی پسند تحریک اور اُس کے منشور کے زیر اثر اُردو افسانہ فی الوقع زندگی کے مسائل

سے گتھ گیا۔ سیاسی و سماجی شعور، پوری آب و تاب کے ساتھ اُبھرنے لگا۔ خیالی اور رومانی دنیا کو تج کرے سامنے کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی دنیا کو اہمیت دی جانے لگی۔ اس دنیا میں شہر دیہات، امیر و غریب، کسان اور مزدور سبھی شامل تھے۔ افسانہ نگاروں کا اصل مقصود، چونکہ اس دنیا کو بنی نوع انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ حیات افروز اور خوش آئند بنانا تھا۔ اس لیے اشتراکیت، جمہوریت آزادی، غلامی، امریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی تنگ نظر، نسلی برتری، معاشی جبریت، نفسیاتی، پیچیدگیاں جنسی الجھنیں، معاشرتی ناہمواریاں بھی زیر بحث آئیں۔"(۵۵)

ان افسانوں میں منافقت، معاشرے میں پایا جانے والا دوغلہ پن، لالچ، ماضی پرستی سبھی کے خلاف نعرہ بلند کیا گیا اور ادب کے ذریعے ہندوستانی عوام کے جذبات کے ترجمان ہے۔ بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:

"ان افسانوں میں پرانی اقدار سے نفرت، مذہبی انتہا پسندی اور منافقت کے خلاف احتجاج، مفلسی سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ، سماج کی عائد کردہ پابندیوں کے خلاف ایک جارحانہ آواز تھی۔ اس آواز میں ان نوجوانوں کا ذہنی انتشار بھی نمایاں تھا جو ملک کی غیر یقینی صورت حال سماجی اور سیاسی دباؤ، ملک کے روایتی ادب، ماضی پرستی اور مصلحت اندیش سیاست نے پیدا کیا تھا۔"(۵۶)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانے میں ہمیں حقیقت نگاری کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے صرف سماجی حقیقت کو عیاں کیا۔ ان میں حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، سہیل عظیم، بلونت سنگھ اور شوکت قابل ذکر ہیں۔ کچھ ایسے حقیقت نگار ہیں جنہوں نے رومانوی حقیقت نگاری کو اپنے افسانے میں عیاں کیا۔ ان میں کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ اور انور عظیم تھے۔ تیسرے نمبر پر بے باک حقیقت نگار ہیں۔ ان میں منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد اور احمد علی شامل ہیں۔ یہ تمام افسانہ نگار حقیقت نگاری کے چاہے جس بھی پہلو کو نمایاں کرنے والے ہوں ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ معاشرے کی کھردری حقیقت کو سامنے لایا جائے۔

حیات اللہ انصاری ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں بے باکی اور سچائی کا فن نمایاں کیا۔ پڑھتے وقت واقعات غیر معمولی سے لگتے ہیں مگر ان میں بڑے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا اساسی موضوع ہندوستان کی سماجی پستی اور معاشی بد حالی ہے۔ان کے واقعات حقیقی نظر آتے ہیں''۔(۵۷)

ان کا پہلا افسانہ بڈھا سود خور تھا۔ باقی افسانوی مجموعے ''انوکھی مصیبت''''بھرے بازار'' اور ''شکستہ گنگورے'' ہیں۔ ''شکستہ گنگورے'' میں منیر کے مکان کی تصویر کشی کرتے ہوئے انہوں نے جاگیر دارانہ نظام کی دم توڑتی حالت کو بیان کیا ہے۔ ان کا افسانہ ''آخری کوشش'' اس سنجیدگی سے لکھا گیا کہ اُسے پڑھ کر پریم چند کے افسانے ''کفن'' کا گمان ہونے لگتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمیٰ لکھتے ہیں:

> ''جس افسانے نے حیات اللہ کو دور اول کا افسانہ نگار بنایا۔وہ ''آخری کوشش'' ہے۔۔۔ اس میں انسان کے بنیادی مسائل کا عرفان ہے''(۵۸)

انہوں نے زندگی کے چھوٹے مسائل کو اپنے فن کے جادو سے اس طرح دکھایا کہ وہ چھوٹے نہیں لگتے۔ افسانہ شکر گزار آنکھیں کی عبادت ملاحظہ ہو۔

> ''اکتوبر ۴۷ء سے پہلے میرے سینے میں ٹپکتے ہوئے سات سات چھالے تھے اور ساتوں نے مل کر دل کو پھوڑا بنادیا تھا۔ماں باپ کے قتل کا چھالا۔جوان بیٹے کے قتل کا چھالا، دودھ پیتی بیٹی کے قتل کا چھالا اور جیون سنگھی گھر کی لکشمی کے قتل کا چھالا۔۔۔میری بیوی کے ساتھ کہیں کہیں شرمناک حرکتیں، اور معصوم بچوں کی ماں کی آنکھوں کے سامنے قیمہ بنایا جانا''(۵۹)

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت کو بیان کیا ہے اور انسان کی داخلی واردات کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ بیدی نے انسانی دکھوں کی نقاب کشائی اس طرح سے کی کہ ان کا دُکھ ہر

انسان کو اپنا دکھ نظر آنے لگا۔ وہ زندگی کی چھوٹی بات میں گہرے معنی پیدا کر کے اُسے تاثیر سے بھرپور بنا دیتے ہیں ''بھولا''، ''بیل''، ''گرم کوٹ''، ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''لاجونتی''، ''صرف ایک سگریٹ'' جیسے افسانوں میں بیدی نے زندگی کی حقیقت میں معنی کے رنگ بھر دیئے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، لمبی لڑکی، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے اور مکتی پودھ کے افسانے اُردو ادب کا قد بلند کرنے والے ادیب کی تخلیقات ہیں۔''(۶۰)

انسانی غم و دکھ، الجھنیں ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ انہوں نے جن حالات اور جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اُسی ماحول کا عکس ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ نچلے طبقے کی زندگی کے تلخ نشیب و فراز کو انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں پرکھا۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> ''بیدی کے کردار اپنے ماحول میں پوری طرح بسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے افسانے کو زندگی کے عام چلن سے جُدا نہیں ہونے دیتے۔۔۔ عورت کی مظلومیت، بے بسی اور سماج کی تہہ در تہہ دیواروں کے بیچ اس کی لاچارگی بیدی کے ہاں ہندوستانی تہذیب کے تخلیقی جمود کی علامت بن کر ابھری ہے''(۶۱)

افسانہ ''گرم کوٹ'' کو اُن کے اچھے افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی ایک غریب کلرک کی داستان غم بیان کی گئی ہے۔ یہ افسانہ اُس دور کے سماجی و معاشی مسئلے کو سامنے لاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے اور وہ حقیقت کے عکاس ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی سماج کی غلط قسم کی پابندیوں، انسانیت کا استحصال کو افسانے کے ذریعے واضح کیا۔ یہ ہمیشہ معتدل اور دھیمے مزاج میں حقیقت کا انکشاف کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ لاجونتی سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بٹوارا ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اُٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا۔ اور پھر سب مل کر اُن کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے لیکن دل زخمی، گلی گلی، محلے محلے میں پھر بساؤ کمیٹیاں بن گئی تھیں۔۔۔ لیکن ایک پروگرام ایسا تھا۔ جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا'' دل میں

بساؤ"۔(۶۲)

اس افسانے میں تقسیم کے وقت اس سانحے کا شکار ایک مغویہ عورت کے نازک اور مجروح ہو جانے والے احساسات اور سماج میں ظاہر داری کا بھرم رکھنے کی کہانی ہے۔ افسانے "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں ایک سیدھی سادی، وفاشعار بیوی کے دُکھ کی داستان ہے جس نے سہاگ رات میں اپنے خاوند کے حصے کی ساری ذمہ داریاں اور اُس کے سارے دکھ مانگ کر بدلے میں اُسے سکھ و خوشی نصیب کی ۔ لیکن خود ساری زندگی خدمتوں کے بدلے اُسے اُس کے شوہر کے بے وفاہی نصیب ہوئی۔ کرشن چندر کو ترقی پسند افسانے کے دور کا روشن ستارہ کہا جاتا ہے ان کے اہم موضوعات سماجی اور انسانی مسائل ہیں ۔ ان کے افسانوں کے ابتدائی مجموعوں " طلسم خیال " ،"نظارے" اور " ٹوٹے ہوئے تارے" ہیں ان کے افسانے " مہالکشمی کا پل" ،"کالو بھنگی"، "کچرا بابا" میں عصری صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> "سماج کی ناگفتہ بہ حالت اور سیاسی و معاشی جبر ان کے افسانوں میں اولیت اختیار کر گیا۔ انہوں نے پسے ہوئے مظلوم طبقوں کی حمایت اور سامراج لوگوں کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا اور سماجی و انقلابی حقیقت نگار کی حیثیت سے افسانے لکھے"(۶۳)

وہ مارکسزم کی اشتراکیت سے متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی رومانوی روش اور میٹھے لہجے کو خیر آباد کہہ کر حقیقت کی طرف رجحان کیا ور انسانیت کی مشکلات، مسائل، جبر، ظلم اور استحصال کو قلم کی نوک تک لائے۔ ان کے دھیمے لہجے میں بھی غم و غصہ نظر آتا ہے۔ ظلم کرنے والی طاقتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے اور نئے سماج کی تشکیل کرنے پر انہوں نے اپنی تمام قوت صرف کی۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> "وہ مزدور سے زیادہ مزدور عورت کے افسانہ نگار ہیں ۔ مزدور عورت کی بد قسمتی ہندوستان میں دوہری ہے ۔ ایک تو طبقاتی اور دوسرے جنسی ۔ اُن کا محبوب ترین موضوع سرمایہ دار ہوس پرنادار عورت کی قربانی ہے"(۶۴)

ان کے افسانے جنت اور جہنم"، "بندوالی""سفید پھول"، "ٹوٹے ہوئے تارے"، "اندھا چھترپتی" اور اس طرح کے کئی اور افسانے ہیں جن میں عورت کی تباہی و بربادی کی داستان موجود ہے۔ ہندوستان کے اندر طبقات کی کشمکش وہاں کے مہاجنی نظام کی پیداوار ہے۔ جو ان افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کے ہاں غربت کے

ہاتھوں مجبور عورتیں بھی ملتی ہیں جو پانچ روپے کے عوض بک جاتی ہیں۔ پہاڑی ان پڑھ عورتیں جو امیروں کے ہاتھوں بکتی ہیں اور وہ پڑھی لکھی عورتیں بھی جن کی مرضی کے خلاف انہیں بیاہ دیا جاتا ہے۔ غرض عورت کی مجبوریوں کو کئی پہلو سے بیان کیا گیا ہے اور ان کی ہر تحریر سے انسانیت سے بے لوث محبت دکھائی دیتی ہے۔ شکیل الرحمٰن کا کہنا ہے۔

> ''کرشن چندر کے کردار اور موضوعات ندی کے بہت ہی صاف شفاف پانی کا احساس بخشتے ہیں۔ واقعات کا ارتقاء ہو یا کرداروں کا عمل، سب صاف اور واضح ہیں ان کے سب افسانے زندگی کے حسن اور معاشرے کی بدصورتی کو بہت صاف طور پر بیدار رکھتے ہیں''(۶۵)

ہندوستان کی طبقاتی تقسیم کے خلاف تھے اس میں برابری چاہتے تھے۔ غریبوں کی زندگی کو سنوارنے کی ہمیشہ انہوں نے بات کی۔ ان کے موضوعات میں غریب طبقہ، بھوک، ننگ و افلاس، سیاست، اقتصادیات، مساوات سبھی چیزیں شامل ہیں۔ جو کہ ان کے ترقی پسند مصنف اور ایک حقیقت نگار ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''سماج کی ظالمانہ اونچ نیچ، بے رحمیوں اور بے انصافیوں کا احساس کرشن چندر کو آغاز ہی میں ہونے لگا تھا۔ لیکن شعور دھندلا سا تھا۔ مارکسزم اور اشتراکی نظریات کے مطالعے نے صرف اتنا کیا کہ ان سمتوں اور میدانوں کی نشاندہی کر دی جن کی طرف اس جوالا مکھی کے لاوے کو بہنا تھا''(۶۶)

ان کے افسانوی مجموعے میں شامل افسانہ ''جہلم پر ناؤ'' ایک متوسط طبقے کی کہانی ہے۔ ان کے بہت سارے افسانوں جیسے ''تالاب کی حسینہ''، مجھے ''کتنے نے کاٹا''، ''قبر'' میں زندگی کی تلخ اور کڑوی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ان کے افسانے ''گرجن کی ایک شام'' میں بھی اعلیٰ اور ادنیٰ کا تضاد دکھایا گیا ہے۔ ایک اور افسانہ ''زندگی کے موڑ پر'' ہے جس میں زندگی کی ناہمواریوں اور جاہلانہ رسم و رواج پر طنز ہے۔ افسانہ ''مہالکشمی کا پل'' آزادی پر بنایا گیا افسانہ ہے جو کسی کو نصیب نہ ہوئی اور آزادی کا محض خواب ہی دکھایا گیا۔ مگر آزادی کے بعد بھی وہی حالات رہے جو پہلے تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

"کرشن چندر بنیادی طور پر انسان دوست، ترقی پسند اور سماجی حقیقت نگار ہیں۔ چنانچہ وہ سماج کی کجروی، زیادتی، جبریت، بہمانہ انداز اور ناانصافی پر جھنجھلا جاتے ہیں۔ ان کے افسانے "دو فرلانگ سڑک"، "زندگی کے موڑ پر"، "مہالکشمی کا پل"، "کچرا بابا"، "ان داتا" اس نوع کے افسانے ہیں جن میں کرشن چندر کا فن پوری جولانیوں اور شدت جذبات سے نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا فن اس مردہ معاشرے کے مردہ اور بے رحم رویوں پر ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے"(۶۷)

افسانہ "لیڈر کی کرسی" میں اقتدار، لالچ، ہوس کو نشانہ بنایا گیا ہے کہ جب تک انسان ان چیزوں سے دور رہتا ہے تو وہ انسانی اخلاق کے حدود و قیود میں رہتا ہے مگر جونہی اُسے دولت و شہرت اور لالچ کی لت پڑتی ہے تو وہ ان حدود سے گزر کر بہت آگئے چلا جاتا ہے جہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ غرض ان کا یہ افسانہ اخلاقی زوال کی علامت ہے۔ انہوں نے سیاست، امیرانہ طرز اور شہرت ہر چیز کے بارے میں ایسے طنزیہ لہجہ اختیار کیا کہ اُس طنز میں سخت کاٹ شامل ہوتی ہے۔ افسانہ "خونی ناچ" ایک مزدور کی کہانی ہے جو ٹانگے کے نیچے آکر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے مگر چونکہ غریب تھا۔ لہٰذا سڑک پر چلنے والی مصروف زندگی نے اُسے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ افسانہ "صرف ایک آنہ" میں جب انسان پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے بھکاری بن جاتا ہے تو بھی کسی کے لیے یہ حیرانی کی بات نہ تھی۔ ان افسانوں سے لگتا ہے کہ انسان کے لیے انسان کی اہمیت نہ رہی اور ہر بندہ نفسا نفسی کے عالم میں دوڑے چلا جارہا ہے۔ ہمدردی اور خلوص صرف نام کو رہ گئے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک نے بھی نچلے متوسط طبقے سے محرومیوں اور نارسائیوں کی اندروہ ناک حقیقتیں تلاش کیں۔ اور انہیں افسانے کا روپ دیا "کونپل"، "قفس"، "چٹان"، "ڈاچی" اور "پلنگ" جیسے مجموعوں میں انہوں نے پریم چند کی طرح زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا نیز پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں ان کا کافی اہم کردار رہا ہے۔ عزیز احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"پریم چندر کی طرح انہیں بھی نچلے طبقے کے مصائب، مسائل، خرابیاں، بہودگیاں، پریشانیاں بیان کرنے میں کمال حاصل ہے"۔(۶۸)

انہوں نے اپنے افسانوں میں نچلے متوسط طبقے کی عورت کی بے بسی اور محتاجی کے حوالے سے بھی لکھا جو کہ عدم مساوات کا شکار ہے اور غریب عورت کی طرح نہ وہ خود مزدوری کر کے پیٹ بھر سکتی ہے اور نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کی طرح اپنی محرومی دور کر سکتی ہے۔ ''کونپل''، ''قفس''، ''چٹان'' ایسے ہی افسانے ہیں۔ مزدور طبقے کے حوالے سے لکھے جانے والے افسانے میں خلوص اور ہمدردی کا پہلو نمایاں ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ان کے ہاں رومانوی اور جنسی حقیقت بھی نظر آتی ہے۔ ان کا افسانہ ''اُبال'' جنسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''اوپندر ناتھ اشک کے یہاں نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کی عکاسی بھی ہے، جنسی معاملات کی فنی گرفت بھی، اور انسان کی بے بسی اور مجبوری کا قصہ ہے''(۶۹)

افسانہ ''کونپل'' سے اقتباس

> ''سنیکری کی مسرت اور خوشی کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں اپنے پویلے مُنہ لیے ہنسیں اور اس کی خوش بختی کی تعریف کر کے اسے دعائیں دیتیں، بِھک منگے برہمن کی لڑکی اتنے بڑے گھر جا رہی ہے۔ لیکن گاؤں کی نوجون لڑکیوں کو اس کی خوش بختی پر کچھ ایسا رشک نہ تھا۔ سنیکری سوت پر جا رہی ہے اور پچاس سالہ دولہا کی پہلی بیوی بھی موجود ہے۔''(۷۰)

سعادت حسن منٹو ایسا افسانہ نگار ہے جس نے معاشرے کی کھردری حقیقت کو پیش کیا۔ منٹو نے اس بات سے بے نیاز ہو کر حقیقت عیاں کی کہ معاشرہ کیا کہتا ہے اور لوگ ان کے کام پر تنقید کریں گئے اور انہیں نفرت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ انہوں نے نہ صرف جنسی حقیقت نگاری کو موضوع بنایا بلکہ ہندوستانی سامراج کے خلاف بھی بہت لکھا۔ ان کے افسانے ''خونی تھوک''، ''انقلاب پسند''، ''نیا قانون''، ''تماشا'' میں انگریز حکومت کی من مانی اور ہندوستانیوں کی مجروح ہوتی عزت اور پھر سامراج حکومت کے خلاف ان کے جذبات کا بھڑ کناد کھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اس کے سینے میں برطانوی سامراج کے خلاف کیسا لاوا اُبل رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی استحصال سے اسے کتنی نفرت تھی۔ غربت اور افلاس کے خاتمہ کے لئے اس

کے ذہن میں کیسے کیسے منصوبے تھے۔ معاشی آزادی کو وہ کیسا عاشق اور انسانیت کا وہ کتنا بڑا دوست تھا۔ اس کا اندازہ فی الواقع منٹو کے ابتدائی افسانوں ہی سے ہوتا ہے"(۷۱)

منٹو کا پہلا افسانہ "تماشا" ہے۔ جس میں مارشل لاء جلیانوالہ باغ کے خونیں منظر اور جنرل ڈائر کے وحشیانہ مظالم کی یادگار میں لکھا۔ "تماشا" سے اقتباس:

"دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنیوالے خونی حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو آج سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پر ہوا کرتے تھے۔ اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سوئے پڑے تھے۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔"(۷۲)

منٹو کا افسانہ "نیا قانون" ایک تانگے والے کے جذبات کو بیان کر رہا ہے۔ اور اس کے جذبات گویا تمام ہندوستانی محکوم قوم کے جذبات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ تجارت کرنے کی غرض سے آنے والے یہاں کے مالک ہی بن بیٹھے۔ اور جانے کا نام بھی نہیں لے رہے۔ منگو کوچوان نئے قانون کے خواب دیکھتا ہے اور خوشی میں نئے قانون کی خبر سب کو دیتا ہے۔ اسی خوشی میں ایک گورے کو بھی پیٹ دیتا ہے مگر نئے قانون کے نفاذ پر اسے ہوش آتا ہے کہ نئے میں کیا رکھا ہے۔ جب تک حکمران نہ بدلیں تب تک مایوسی نہیں چھٹ سکتی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔

"نیا قانون ایک انقلابی افسانہ ہے۔ اور اس دور کے تمام ترقی پسند انتخابات میں اسے جگہ دی جاتی ہے۔ منٹو نے منگو کوچوان سے جو باتیں کہلوائی ہیں وہ خود افسانہ نگار کے خیالات معلوم نہیں ہوتے بلکہ اس کوچوان کے سیاسی ردِّعمل اور اس کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔"(۷۳)

افسانہ ''نعرہ'' افلاس زدہ زندگی گزارنے والے ایک شخص کی کہانی ہے جس کو غربت کی وجہ سے جب گالی دی جاتی ہے تو وہ گالی اس کے دماغ میں کھلبلی مچانے لگتی ہے۔ ان کے جو افسانے عورت کے موضوع پر ہیں ان افسانوں میں بھی نفسیاتی الجھنوں اور مسائل کی طرف توجہ دلانا مقصد تھا۔ منٹو ترقی پسند نظریات رکھتے تھے اور ان کے افسانوں میں مارکسزم کی تحریک کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اسی سماج میں بسنے والے لوگوں کی پریشانیوں، مشکلات، مسائل، جذبات کی عکاسی کی ہے۔ چاہے وہ سیاسی مسائل ہوں، معاشی یا پھر نفسیاتی۔

شکیل الرحمٰن کا منٹو کے بارے میں کہنا ہے:

> ''منٹو کے افسانے سماج کے زندہ، متحرک، حسین و خوش جمال کرداروں کا البم نہیں ہیں ان میں ایک عجیب طرز کی کھردراہٹ ہے، کڑواہٹ ہے، جو بعض اوقات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔''(۷۴)

افسانہ ''بلاؤز'' ''ٹھنڈا گوشت'' اور ان جیسے کئی اور افسانے جنسی موضوعات پر لکھے گئے ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے اور انسانی زندگی میں جنسی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ''ٹھنڈا گوشت'' اس حقیقت پر مبنی افسانہ ہے جس کو پڑھ کر ایک طرف رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف ننگی انسانیت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ فسادات کے دوران ایک مری ہوئی لڑکی کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا۔ افسانہ ''کھول دو'' بھی فسادات کے دوان کیمپ کی زندگی میں بالخصوص لڑکیوں کی جہنم زدہ زندگی کے واقعات ہیں۔

افسانہ ''نیا قانون'' سے اقتباس:

> ''اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے متنفّر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔''(۷۵)

غرض یہ کہ منٹو کے افسانے حقیقت نگاری کے ہر پہلو کو نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں احمد ندیم قاسمی پاکستان کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں بھی ہمیں ترقی پسند فکر ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں

نے بالخصوص دیہاتی زندگی کی مشکلات و مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ دیہات میں کس طرح انسان سادہ مزاجی کی وجہ سے وڈیروں اور جاگیر داروں کے سامنے ہمیشہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے حقوق کا پتہ بھی نہیں لہٰذا یہاں جو معاشی و طبقاتی ناہمواری ہے وہی تمام چیزیں حقیقت بن کر احمد ندیم قاسمی کے ہاں جلوہ گر ہوتی ہیں قاسمی کے افسانوی مجموعے ''چوہال''، ''بگولے''، ''طلوع و غروب''، ''گرداب''، ''سیلاب''، ''انچل''، ''آبلے''، ''آس پاس''، ''در و دیوار''، ''سناٹا''، ''بازار حیات''، ''گھر سے گھر تک''، ''کپاس کا پھول''، ''نیلا پتھر'' قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی نظر بالعموم زندگی کی بنیادی صداقتوں اور لطافتوں پر رہتی ہے انہی صداقتوں اور لطافتوں کو تخلیقی انداز سے پیش کرتے ہیں''(۷۶)

انہوں نے سارے افسانے کسی نہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان لکھتی ہیں:

> ''انہوں نے سیاسی و سماجی حالات کا مطالعہ نئے زاویہ نظر سے کیا اور ان سے متعلق پیچیدہ مسائل کا تجزیہ بھی کیا اور ہر سیاسی اور سماجی واقعے پر افسانے لکھے۔ جن میں تقسیم ہند، سرمایہ داری، حاکموں کے ظالمانہ رویے اور عوام دشمن تحریکوں کو پیش کیا۔'' (۷۷)

جس طرح پریم چند کے ہاں دیہاتی زندگی کی تصویر کشی ملتی ہے اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی ہمیں وہی تصویر ملتی ہے۔ وہ خود بھی اُسی ماحول کے پروردہ تھے۔ لہٰذا وہاں کی ہی طرز معاشرت، طبقاتی کشمکش، ظلم و ستم اور غریب سادہ دیہاتیوں کی بد حالی کو پر درد انداز سے پیش کیا۔ ان کا افسانہ ''بگولے'' سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف لکھا گیا ہے دیہات کے بعد جب وہ شہری زندگی کی طرف رُخ کرتے ہیں تو یہاں کی زندگی کے مسائل ایک نیا فسانہ بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ان کا افسانہ ''مشورہ'' ہے جس میں ایک شہری کردار کے ذریعے شہری زندگی کی کئی تہوں کو کھولا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے ''احسان''، ''عورت صاحبہ'' میں شہری زندگی کی ریاکاری اور دکھاوے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ ''اندمال'' میں مشرقی پاکستان کی

علیحد گی، خاندانوں کی تباہی و بربادی، عزتوں کا مٹ جانا پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ ''جوتا'' میں بھی طبقاتی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے لوگ کیسے چھوٹے لوگوں کو مغلوب کر کے ان پر جبر کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں جس طرح وڈیروں اور چھوٹے خدا بننے والوں کے ہاتھوں دیہاتی عورت کا استحصال ہوتا ہے تو غربت کی وجہ سے اونچ نچی آڑے آ جاتی ہے اور کوئی ان کے حق میں آواز بلند نہیں کر سکتا ''رانی''۔ ''میرا دیس''، ''سانولا''''اصول کی بات'' ایسے ہی افسانے ہیں، ''اکیلی'' اور ''سناٹا'' جیسے افسانوں میں غریب لوگوں کی بیٹیوں کی شادی کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر سفر ترقی پسند تحریک کے سائے میں طے کیا۔ لہٰذا ان کے ہاں حقیقت اور مقصد خاص طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

''چوپال اور بھگولے کے تقریباً سب افسانے مقصد سے لبریز ہیں۔''(۷۸)

غلام عباس کو بھی صحیح معنوں میں ایک عظیم افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اُس وقت کے رجحان کے مطابق حقیقت نگاری کو ہی اپنے افسانوں میں برتا۔ ایک ادیب اپنے ہی ماحول اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا غریبی میں آنکھ کھولنے والا یہ ادیب طبقاتی و معاشی تفریق کو ختم کرنے اور برابری، انصاف اور مساوات کے لیے چلنے والی تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''اننڈی''''اوور کوٹ''''کتبہ''''ناک کاٹنے والے'' اور ''سرخ جلوس'' وغیرہ ہیں۔ افسانہ ''کتبہ'' ایک غریب انسان کی ساری زندگی کی امنگوں اور پوری نہ ہونے والی خواہشات کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ جو معاشی مسئلے پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ ایک وضع دار، اصولوں والا انسان جو کبھی اپنی خواہشات پوری نہ کر سکا۔ افسانہ ''اوور کوٹ'' میں غربت میں لتھڑی زندگی گزارنے والے ایسے انسان کی کہانی ہے جو غریب و مجبور ہے۔ لیکن معاشرے کی نظر میں عزت دار بننے کا ڈھونگ رچاتا ہے اور اوور کوٹ کا لبادہ اوڑھ لینے پر مجبور ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

> ''یہ ایک نوجوان کی کہانی جو ظاہر داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے امارت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ اس کی ظاہری خوبصورت اور دلکش شخصیت کی بنا پر اس کی اصل شخصیت اور اندرونی کیفیت ہمارے سامنے نہیں آ سکی۔۔۔۔۔ زندگی بھر اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ وسائل کے محدود ہونے کی بنا پر اپنی خواہشات کی تکمیل

سے قاصر ہے۔"(۷۹)

اس افسانے میں مصنف نے حقیقی زندگی کے چہرے پر چڑھے نقاب کو نوچ کر اُتار پھینکا اور تلخ حقیقت سامنے آگئی جو اس ریاکار اور تصنع والے معاشرے کی علامت بن چکی ہے۔ ان کا افسانہ "دھنک" بھی ہمارے معاشرے میں موجود نام نہاد مولویوں، اور ملاوں کی منافقت کو زیر بحث لاتا ہے اور ان کی منافقت بیان ہوئی ہے اور ان کے تمام افسانوں کے کردار کسی نہ کسی معاشی جبر کے تحت مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمام معمولی کرداروں کے ذریعے انہوں نے معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ بقول شہزاد منظر:

> "غلام عباس بنیادی طور پر حقیقت نگار تھے۔ اس لیے انہوں نے زندگی بھر حقیقت نگاری کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور معاشرے میں جو برائیاں اور اچھائیاں دیکھیں انہیں ہو بہو پیش کرنے پر اکتفا کیا۔"(۸۰)

افسانہ "انندی" اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ بظاہر تو لوگ طوائفوں کے معاشرے پر بُرے اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں وہاں سے نکالنے پر غور و فکر کر رہے ہوتے ہیں اور اس میں تمام محلے کے معززین شامل ہوتے ہیں۔ مگر ان طوائفوں کے معاشی مسئلے کو سدھارنے اور انہیں باعزت بنانے اور اس پیشے سے چھٹکارا دلانے کا کوئی نہیں سوچتا۔ یہیں سے کسی بھی سماج میں موجود لوگوں کی دوغلی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا افسانہ "لچک" میں سیاست دانوں کی مصالحت اور لچک دکھائی گئی ہے۔ ان سیاست دانوں کو صرف تقاریر کرنے کا گُر آتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ دل میں چھپا ان کا چور صرف اپنی ذات کے فائدے تک محدود ہوتا ہے اور وقت پڑنے پر یہ اپنے مفاد کے پلڑے کی طرف جھکتے ہیں۔ علی عباس حسینی بھی ترقی پسند تحریک کو خوش آمدید کہنے والوں میں سے ایک ہیں۔ اسی تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے اُردو افسانے کو ایک اہم موڑ عطا کیا۔ ان کے قابل ذکر افسانوی مجموعے "رفیق تنہائی"، "میلہ گھومنی"، "آئی۔ سی۔ ایس"، "ایک حمام میں"، "ہمارا گانو"، "کچھ ہنسی نہیں ہے"، "سیلاب کی راتیں" اور "ندیا کنارے" ہیں۔ انہوں نے بھی پریم چند کی طرح کسانوں اور مزدوروں کی بات کرتے ہوئے اپنے آپ کو اہم حقیقت نگار کے طور پر منوایا ہے۔ بقول ڈاکٹر اسلم جمشید پوری:

> "علی عباس حسینی نے مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں کی زندگی کی سچی تصویر پیش کی

ہے ۔ خاص کر زمینداروں اور مزدور طبقے کے مابین معاشی رسہ کشی کو انہوں نے خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے۔"(۸۱)

ان کے افسانے "انتقام""دیہات کے مظلوم" غریب انسانوں کی بے بسی اور جاگیرداروں کی ظلم و بربریت کی داستان سنا رہا ہے۔ جس میں وہ خود کو بہت نادر انوکھی اور اہم چیز سمجھتے ہوئے دوسروں کو نکمّی اور گری پڑی مخلوق سمجھتا ہے۔ افسانہ "میلہ گھومنی" بھی ایک ایسا افسانہ ہے جو گاؤں کے بڑے بڑوں کی نام نہاد عزت کا پتہ دیتا ہے جس میں غریب نوکرانیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور غریب چپ میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ ان کے افسانے ہندوستانی سماج کا آئینہ۔ ہیں ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں بھی ترقی پسند افسانے کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے انسان دوستی کی مثالی تصویریں مرتب کرنے کی کوشش کی۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بہت سارے افسانے لکھے جو ہجرت کے المیے اور دکھ کو بیان کر رہے ہیں۔ ان کا افسانہ "امت مرحوم" بھی ایسا ہی افسانہ ہے "چراغ کی لو" بھی غریب گھرانے کی کہانی ہے جس میں ایک باپ اپنی بیٹی کا غربت زدہ ہڈیوں اور جھریوں والا چہرہ دیکھ کر اندر سے ہل کر رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا وہ بھی اپنی ماں کی طرح روٹی اور دوائی کے بغیر ہی مر جائے گی۔ بیٹی باپ سے "چراغ کی لو" بڑھانے کی بات کرتی ہے۔ افسانے میں امیری اور غریبی کی تفریق اور معاشی تنگدستی کا راج دکھایا گیا ہے۔ ان کے ہاں بھی دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح سماجی مسائل ہیں۔ ان کے ہاں بھوک، غریبی، افلاس، معاشرتی اونچ نیچ جیسے موضوعات شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے افسانے "بے کار""بھالو""کاروبار""ایک بچی" اور "سرگوشیاں" سر فہرست ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں حقیقت سے رشتہ جوڑا اور معاشرے کی بے اعتدالیوں کا بیان کیا۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

"ہاجرہ کا موضوع ابتدا ہی سے حقیقی زندگی رہا۔ ادب میں افادیت کی قائل ہونے کے سبب سے لکھتے ہوئے ان کے سامنے ایک مقصد ہوتا تھا۔۔۔ ان کے ہاں سماجی حقیقت نگاری کا رجحان غالب ہے۔ فرد کے انفرادی مسائل کے بجائے اپنوں کی بے اعتدالیاں اور زوال کی داستانیں ملتی ہیں۔"(۸۲)

خدیجہ مستور بھی حقیقت نگاری اور عصری شعور کے دور میں سامنے آئیں۔ انہوں نے خاص طور پر معاشرتی تضادات اور عورت کی مظلومیت کو اپنے افسانوں میں خصوصی اہمیت دی۔ ''بوچھاڑ''، ''چند روز اور'' ''تھکے ہارے'' اور ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' میں انہوں نے نچلے اور متوسط طبقے کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ان کے بہت سارے افسانوں میں پاکستان کی تقسیم کے بعد کے حالات وواقعات اور ان واقعات کا انسان کی نفسیات پر اثر پڑنا دکھایا گیا ہے۔ جن افسانوں میں انہوں نے جنسی موضوع اپنایا تو وہ بھی غربت، ناروا پابندیوں کے باعث پیدا ہونے والی گھٹن کے باطن سے جنم لینے والی کہانیاں ہیں۔ ان کے ہاں آزادی کی خواہش اور پابندی اور غلامی سے نفرت موجود ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانوں میں رشید جہاں کے افسانوں کے طرح عورت کی بغاوت کا عنصر غالب ہے۔ انہوں نے بھی جنس نگاری کے پردے میں معاشرے میں موجود حقائق کو ہی بیان کیا ہے۔ ''کلیاں''، ''چوٹیں'' کے افسانوں میں وہ سماجی حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئیں۔ خود عورت ہونے کے ناطے عورت کے مسائل اور مجبوریوں کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ رکھتی ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے افسانے ''شکر اللہ کا''، ''ایک لڑکی''، ''اتار چڑھاؤ''، ''چوراہا''، ''سردار جی'' اور ''انتقام'' میں ردِّ عمل کی تیزابیت موجود ہے انہوں نے بھی معاشرے میں رائج اخلاقی نظام اور اقدار پر طنز کیا ہے اور لوگوں کے اندر جو تضاد اور کھوکھلا پن ہے اس کو نمایاں کیا ہے چونکہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی تھے۔ لہذا صحافت نے اُن کے اندر سچ بیان کرنے کا حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ لکھتی ہیں:

> ''زندگی کے متعلق ان کا ایک مخصوص سیاسی نقطہ نظر ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں جیسے سماجی زندگی کی معاشی کشمکش، افراد کی ذہنی اُلجھنیں اور پریشانیاں وغیرہ۔ ان کے افسانوں کا پس منظر متوسط طبقہ کی زندگی ہے جس کی وہ ترجمانی کرتے ہیں ۔ زندگی کی سچی عکاسی کا سبق انہوں نے پریم چند سے سیکھا۔''(۸۳)

سہیل عظیم آبادی نے احمد ندیم قاسمی کی طرح دیہاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں پریم چند کا اثر جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ ''الاؤ'' اور ''نئے اور پرانے'' میں دیہاتی سادہ اور عام زندگی کو موضوع بنایا۔ افسانہ ''وقت کی بات'' بھی غریب مزدوروں کی مزدوری اور محنت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ آزادی کے بعد جن ادیبوں نے ترقی پسند افسانہ کی روایت سے فیض اُٹھایا اور اس تحریک کو وُسعت

دی۔ ان میں رام لعل، جیلانی بانو، اقبال مجید، اقبال متین، رتن سنگھ، عابد سہیل، آغا سہیل اور انور سجاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ رام لعل نے کثرت سے لکھا ''ننھا خدا'' اور اکھڑے ہوئے لوگ ان کے چند بہترین افسانے ہیں۔ جیلانی بانو کا موضوع حیدر آباد کا جاگیر دارانہ معاشرہ ہے۔ جیلانی بانو اور عابد سہیل کے ہاں سماجی واقعیت کا بیان ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک نے اُردو افسانے کو رومانوی دنیا سے نکال کر حقیقت کے سانچے میں ڈھالا۔ اس تحریک کو نہ صرف مقبولیت ملی بلکہ ایک بہت بڑی کھیپ اس کے تحت دیکھنے کو ملتی ہے جنھوں نے زوال، جہالت، طبقاتی، ناانصافی کے خلاف آواز بلندی کی اور انسان کے درد و غم کا علمبر دار بن کر اُن کے دکھوں کا مداوا کیا اور انہیں زبان عطا کی۔ پچاس کی دہائی میں افسانہ ایک دفعہ پھر رومانوی اثرات کے تحت آجاتا ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر فورزیہ اسلم لکھتی ہیں:

> ''پچاس کی دہائی میں جس رومانوی افسانے نے سر اُٹھایا اس کی اپنی ہی کچھ وجوہات تھیں۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ نئی نسل کی اس مقام تک رسائی آسان نہ تھی جو ترقی پسند تحریک کے عظیم افسانہ نگاروں نے مقرر کر دی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حقیقت نگاری کی قطعیت سے ذہین اکتائے ہوئے تھے لیکن یہاں یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ اثر نئے حالات کا بھی تھا۔''(۸۴)

مگر اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس تحریک نے لوگوں کو سچ سننے اور سچ کہنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ان کی بے رحم حقیقت نگاری نے نہ صرف لکھنے والوں کے خلوص کو ظاہر کیا بلکہ پڑھنے والوں کو اس صداقت میں کشش محسوس ہوئی کیونکہ ایسا ادب لوگوں کے زخم پر مرہم پٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو کمزوروں، غریبوں اور بے بس لوگوں کی طاقت بھی تھا اور آواز بھی۔

اس تحریک نے ادب اور سماج کا آپس میں ایک گہرا ربط قائم کیا۔ اِن تمام ادیبوں نے ادب کو سماج کے ساتھ جوڑنے کی تحریک کو ترویج دیا اور بعد کے ادیبوں کے اندر ایک گہرا سماجی شعور بھی انہی کی وجہ سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

د۔ محمد الیاس تعارف

ا۔ محمد الیاس شخصیت و مختصر کوائف

محمد الیاس افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار بھی ہیں۔ اپنی خداداد صلاحتیوں کی وجہ سے افسانے کی دنیامیں انہوں نے اپنانام بنایا۔ اپنے دوستوں کے علاوہ باقی لوگوں سے بہت کم ملتے تھے لیکن گوشہ نشینی میں رہنے کے باوجود ان کے کام نے انہیں لوگوں سے متعارف کروایا۔ کافی عرصہ کاروبار کے سلسلے میں میرپور آزاد کشمیر بھی مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی ان کے چاہنے والوں میں کمی نہیں۔ آج کل وہ راولپنڈی بحریہ ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں۔

خاندانی پس منظر:

گجرات میں ۲۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق راجپوتوں کے قبیلے سیال سے ہے۔ راجپوتانہ سے آنے والے اس قبیلے نے جھنگ میں رہائش اختیار کی۔ اس بارے میں محمد الیاس کا کہنا ہے۔

> ”پرکھوں میں مراد بخش سیال کے جھگڑوں سے جان بچا کر گجرات کے قریب دریائے چناب کے کنارے ایک ملاح کے پاس روپوش رہے اور اس کی بیٹی سے شادی کر لی۔“(۸۵)

بچپن سے ہی نفاست پسند تھے اور لباس کے معاملے میں شروع ہی سے بہت زیادہ Selective تھے۔ زندگی میں دو شخصیات والد اور والدہ سے بہت پیار کیا۔ ان کی والدہ کا تعلق بھی منہاس راجپوت خاندان سے ہے۔ حلال روزی کمانے اور محنت کرنے کی عادت انہوں نے اپنے والد سے سیکھی۔ کیونکہ ان کے والد بھی ساری زندگی مختلف کاروبار کرتے رہے اور محنت کرتے رہے۔ مصنف کا کہنا ہے:

> ”میرے والد صاحب بہت خوب صورت اور محنت کرنے والی شخصیت تھے۔ اب وہ اس دنیامیں نہیں رہے لیکن بہت یاد آتے ہیں۔“(۸۶)

جب ان سے ان کے ماں کے بارے میں پوچھا گیا تو بولے:

"ماں بھی بہت دلآویز شخصیت کی مالک تھیں۔ اس لیے عمومی طور پر گھر کا ماحول بہت اچھا رہا۔ محبت اور ایثار کا جذبہ کار فرما رہا۔"(۸۷)

محمد الیاس سات بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے لہٰذا انہوں نے اکلوتے بھائی کے ناز نخرے بھی اُٹھائے اور بھائی نے بھی بہت پیار اور محبت سے بہنوں کے ساتھ ایک خوبصورت بچپن گزارا۔

تعلیم:

مصنف کی تعلیم کا سلسلہ بی۔ اے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میٹرک کرنے کے بعد مختلف پیشہ وارانہ کورس کیے۔ جن میں شارٹ ہینڈ اور نقشہ نویسی قابل ذکر ہیں۔ انٹر میڈیٹ کے بعد پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹینٹس میں داخلہ لیا۔ لیکن جلد ہی وہ بھی چھوڑ دیا۔ لیکن شروع ہی سے ان کی شخصیت میں مختلف خوبیاں پوشیدہ تھیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ڈارئنگ اور پینٹنگ وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اکثر ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز سکول کے مقابلوں میں شامل ہوتیں اور داد وصول کرتیں۔

ملازمت:

بی۔اے کرنے کے بعد کراچی میں ایک پرائیویٹ ادارے سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سے بھی تھوڑا عرصہ ملازمت کے سلسلہ میں منسلک رہے۔ معدنیات کی تلاش و فروخت کا پیشہ بھی اپنایا اسی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں وقت گزارنے کا موقع ملا۔

ازدواجی زندگی اور بچے:

محمد الیاس نے ۱۹۷۵ء میں شادی کی جو کہ ایک پڑھی لکھی خوش مزاج اور سلیقہ مند بیوی ثابت ہوئیں۔ مصنف کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مگر چھوٹا بیٹا سانول ۴ سال کا تھا جب اُسے کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا۔ جس کا صدمہ ماں باپ کے دل میں ہمیشہ رہے گا اُسی کی یاد میں مصنف نے اپنا ایک افسانہ "بوسۂ وداع" بھی لکھا۔ جو کہ "اوراق" لاہور سے شائع ہوا۔

تخلیقی سفر:

محمد الیاس کو شروع سے ہی شاعری کا شوق تھا اور چھوٹی عمر سے ہی شاعری بھی کی مگر شاعری کو باقاعدہ انہوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ نہ بنایا۔ پھر افسانہ نگاری کرنے لگے اور افسانہ نگاری کا آغاز بھی انہوں نے سکول کے زمانے سے کیا۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے۔

> ''زمانہ طالب علمی کے ابتدائی دور میں سب سے پہلے پریم چند کا افسانہ ''کفن'' پڑھا تو انتہائی متاثر ہوا اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اسی طرح سے افسانہ لکھوں''(۸۸)

لہٰذا میٹرک کے امتحان کے بعد فارغ وقت میں ۱۹۶۱ء میں انہوں نے پہلا افسانہ ''بڑا باپ'' لکھا جو کہ کراچی سے شائع ہونے والے رسالے ''شمع'' میں شائع ہوا۔ دوسرا افسانہ لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''ڈائریکٹر'' میں چھپا۔ پھر اسی طرح تیسرا افسانہ ''انٹرویو'' بھی ''شمع'' میں شائع ہوا جو کہ لاہور سے جاری ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ انہوں نے افسانوں کو خیر آباد کہا اور اپنی توجہ ملازمت کی طرف کی۔ مگر ۱۹۹۰ء میں جب ان کے بیٹے سانول کا انتقال ہوا تو اس صدمے کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوا۔ اُسی کی یادوں کو دل سے لگائے ہوئے کسی سوچ اور غم نے انہیں اپنے اندر کے تخلیقی انسان کی پہچان کروائی۔ اپنے اسی غم کو انہوں نے قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اس کے بعد محمد الیاس تسلسل سے لکھنے لگے۔ ارشد نعیم کا کہنا ہے۔

> ''محمد الیاس کے افسانے ''بوسۂ وداع'' (مطبوعہ ۱۹۹۶ء اوراق لاہور) سے اُردو دنیا اس تازہ کار افسانہ نگار سے متعارف ہوئی اور محمود ہاشمی، جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اکابرین ادب نے کھلے بازو سے ان کا استقبال کیا۔''(۸۹)

اُردو ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اس سلسلے میں یہ کہتے ہیں:

> ''اُردو ادب نے مجھے زندگی عطا کی ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ میری ریزہ ریزہ ہستی از سر نو یک جا ہوئی ہے اور پھر اُردو ادب کے طفیل ان گنت چاہنے والے ملے بے شمار ان

دیکھی محبتیں میرے دامن میں سمٹ آئی ہیں۔"(۹۰)

شخصیت و فن:

محمد الیاس کی شخصیت کے بارے میں ان کی اہلیہ کا کہنا ہے:

"الیاس ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہایت ذمہ دار، ہمدرد، مخلص اور خوش مزاج انسان ہیں۔ ہر رشتے کو بخوبی نبھانا جانتے ہیں۔"(۹۱)

سید اعجاز بخاری کا کہنا ہے:

"بہت اچھا دوست اور ملنسار انسان تھے۔ اصولوں کے پابند تھے لہٰذا بعض لوگوں کو لگتا کہ یہ سخت ہیں مگر سچ یہ ہے کہ دوسروں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔"(۹۲)

ڈاکٹر رشید امجد کی رائے ہیں:

"محمد الیاس اچھے دوست اور بہت عمدہ انسان ہیں جو ابھی تک ہماری پرانی اقدار کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں ان اقدار میں دوسروں کے لیے محبت، خلوص اور قربانی کا جذبہ شامل ہے۔ ان عمدہ اقدار نے ان کی کہانیوں کے کرداروں پر بھی اثر ڈالا ہے اور ان کے کردار انسانیت اور احترام انسانیت کے علمبردار ہیں۔"(۹۳)

پروفیسر منیر یزدانی لکھتے ہیں:

" محمد الیاس ایک اچھے مصنف ہی نہیں ایک اچھے انسان اور اچھے دوست بھی ہیں۔ انہوں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ میر پور آزاد کشمیر میں بسلسلہ روزگار گزارا اس عرصہ میں ان سے اکثر ادبی نشستیں رہیں۔ ان ملاقاتوں میں نقاد ادیب اور شاعر سید مسعود اعجاز بخاری، معروف شاعر مشتاق شاد، آزاد نظم کے منفرد لہجے کے شاعر نصیر احمد ناصر مظہر جاوید حسین، نذیر انجم، محمد انیق بھٹی اور میر پور کی دیگر علمی و ادبی شخصیات سے علمی و ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ علی ٹریڈرز کے نام سے ان

کی سٹیشنری کی دوکان تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک ادبی مرکز بھی تھا۔"(۹۴)

فن:

اُن کے فن کے بارے میں مختلف لوگوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے ان کے افسانوں کے متعلق کہا۔

> "ان کے موضوعات سماجی ہوتے ہیں اور وہ کردار کی ایسی تخلیق کرتے ہیں کہ ان کی سماجی نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اُن کے ہاں مزاحمتی رویہ بھی موجود ہے۔"(۹۵)

اُن کے افسانوں کے موضوعات عام آدمی کے مسائل بھی ہیں اور ان کرداروں کو بھی دکھایا گیا ہے جو معاشرتی روابط اور معاشرتی رویوں کو بگاڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ سید مسعود اعجاز بخاری لکھتے ہیں:

> "محمد الیاس ایک ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہر طبقہ کے افراد کی کامیاب تصویر کشی ملتی ہے۔ عام آدمی سے لے کر معاشرے کے سر کردہ کرداروں کی نفسیات کو ملحوظ رکھا ہے اور انہیں پیش کرنے میں مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔"(۹۶)

یوں تو ہر ادیب معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے کہ مگر ایسے ادیب بہت کم ہیں جو جرات مندانہ طریقے سے ایسے زخموں کو دکھاتے ہیں کہ جو ناسود بن کر چمٹ جاتے ہیں۔ محمد الیاس کا شمار بھی ایسے جرات مند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ راضیہ شمشیر لکھتی ہیں۔

> "محمد الیاس کے ہاتھ میں پہنچ کر معانی و کہانی کی سطح اکہری نہیں رہتی بلکہ اس میں دوہرا پن پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کے باطن کو جھنجھوڑتا اور اس کے حسیات کو فعال بناتا ہے۔ ان افسانوں کو مشکل ہی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ نہ صرف باشعور ادب کے منتظر سے زیادتی ہو گی بلکہ ایک بالغ النظر افسانہ نگار سے بھی۔"(۹۷)

تصانیف:

محمد الیاس نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے ۱۱ افسانوی مجموعے اور ۶ ناول ہیں۔ نیز ایک سوانح عمری اور سفر نامہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہے۔ ان کی تصانیف اور سن اشاعت کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ افسانے:

۱۔ لوح ازل یہ لکھی کہانیاں	۱۹۹۵ء
۲۔ مور پنکھ یہ لکھی آنکھیں	۱۹۹۷ء
۳۔ صدیوں پہ محیط اک سفر	۱۹۹۸ء
۴۔ منظر پس غبار	۲۰۰۰ء
۵۔ دوزخ میں اک پہر	۲۰۰۵ء
۶۔ اندھیر نگری کے جگنو	۲۰۱۳ء
۷۔ مورتیں	۲۰۱۴ء
۸۔ آئینے میں گم عکس	۲۰۱۵ء
۹۔ گلیوں اور بازاروں میں	۲۰۱۶ء
۱۰۔ کٹڑیاں چوبارے	۲۰۱۶ء
۱۱۔ چڑیاں اداس ہیں	۲۰۱۹ء

۲۔ ناول:

۱۔ کہر	۲۰۰۱ء
۲۔ برف	۲۰۱۰ء
۳۔ بارش	۲۰۱۲ء
۴۔ پروا	۲۰۱۳ء
۵۔ دھوپ	۲۰ء

۶۔ حبس ۲۰۱۸ء

۷۔ عقوبت نفس (دو نارلٹ کا مجموعہ) ۲۰۱۹ء

اس کے علاوہ ایک سوانح حیات ''فرد حقیقت'' جو کہ ان کے دوست کے حوالے سے ہے ۲۰۰۳ء میں چھپی۔ ابھی مصنف کا سفر رکا نہیں بلکہ اُردو ادب کے لئے، اپنے چاہنے والوں اور ان کو پڑھنے والوں کے لیے وہ وقتاً فوقتاً کئی نادر و نایاب تخلیقات منظر عام پر لاتے رہیں گے۔ ان کی یہ عمدہ تصانیف اور ان کا کام ہی مصنف کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروان ادب ملتان، صدر، ۱۹۸۹ء، ص:۱۷

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص:۳۸

۳۔ راجہ شکیل انجم، ادب زندگی ہے، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء ص:۲۵

۴۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور زندگی، انجمن ترقی ادارہ اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۵ء، ص:۴۵۱

۵۔ یوسف تقی، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اُردو نظم، پرنٹ دِل آفیٹ، کلکتہ، ۱۹۸۰ء، ص:۶

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار (تنقیدی مطالعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۳۱

۷۔ خاور جمیل، نئی تنقید، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص:۲۸۰

۸۔ صدیق احمد، پروفیسر، ادب اور زندگی (مجنوں گورکھپوری کے چند تنقید ات کا مجموعہ)، اُردو گھر علی گڑھ، ایوان گورکھپور، ۱۹۸۴ء ص:۴۷

۹۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص:۶۷

۱۰۔ شہزاد منظر، جدید اُردو افسانہ اور عصری آگہی، منظر پبلیکشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۸۲

۱۱۔ پریم چند (خطبہ) انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس، مشمولہ، ترقی پسند تحریک کا سفر، جمال نقوی، ڈاکٹر، پیس پبلی کیشنز اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۲۱۔۲۰

۱۲۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء ص:۵

۱۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص:۵۸

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور ۱۹۹۸ء، ص:۳۶۴

۱۵۔ https:#www.urdupoint.com

۱۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص:۴۴

۱۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب و تکنیک کے تجربات، ص:۱۱۰

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، ص:۳۶۵

۱۹۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فائونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص:۲۶
۲۰۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروان ادب ملتان، صدر، ۱۹۸۶ء ص:۱۵
۲۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص:۵۹
۲۲۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص:۱۷
۲۳۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص:۱۲۷
۲۴۔ شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۲۱
۲۵۔ پروفیسر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو ادب کے افسانوی اسالیب، ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص:۹۸
۲۶۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، ص:۶۶
۲۷۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، ص:۶۹
۲۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، ص:۳۷۱
۲۹۔ سید احتشام حسین پروفیسر (مضمون) اُردو افسانہ ایک گفتگو، مشمولہ، اُردو نثر کا فنی ارتقاء، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، عفیف آفیسٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۴۳
۳۰۔ وقار عظیم، پروفیسر (مضمون) کہانی اور حسن بیان، مشمولہ، اُردو نثر کا فنی ارتقاء ص:۲۶
۳۱۔ نگہت ریحان خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، بک وائز ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۶۵
۳۲۔ پروفیسر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو دادب کے افسانوی اسالیب، ص:۱۰۱
۳۳۔ شمیم حنفی، پریم چند کے افسانے (بڑے گھر کی بیٹی سے کفن تک) انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی ۲۰۰۶ء، ص:۱۴۶
۳۴۔ محمد صادق، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں پریم چند کی روایت (مضمون) مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تنقید، مرتبہ: شارب ردولوی، پروفیسر، اُردو دو اکادمی دہلی، س ن، ص:۳۰۵
۳۵۔ محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند افسانے کے پچاس سال، مشمولہ، ترقی پسند ادب (مرتبین)، رہیس قمر، ڈاکٹر، سید عاشور کاظمی مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۴ء، ص:۳۷۷
۳۶۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکینکی مطالعہ، ص:۶۲
۳۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو دو افسانے میں اسلوب اور تکینک کے تجربات، ص:۱۱۳
۳۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر اُردو افسانے کے تین ادوار (مضمون) مشمولہ، اُردو افسانہ روایت و مسائل، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۳

۳۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، ص:۴۷۲
۴۰۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص:۵۵
۴۱۔ آل احمد سرور، اُردو میں افسانہ نگاری (تنقیدی مضمون) مشمولہ، اُردو افسانہ روایت و مسائل، گوپی چند نارنگ، ص:۹۴
۴۲۔ احمد علی، مہاوٹوں کی ایک رات (افسانہ) مشمولہ، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر مکتبہ جامعہ نئی دہلی، س ن، ص:۱۲۶
۴۳۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص:۱۸۱
۴۴۔ ایضاً، ص:۱۷۶
۴۵۔ قمر رئیس، پروفیسر، اُردو افسانے میں انگارے کی روایت (مضمون) مشمولہ، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تنقید، شارب ردولوی، پروفیسر (مرتب)، ص:۲۹۶
۴۶۔ ایضاً، ص:۲۹۷
۴۷۔ شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین، ص:۲۹۵
۴۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص:۸۷
۴۹۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو د افسانے میں اسلوب اور تکینک کے تجربات، ص:۱۳۳
۵۰۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک کا سفر (پس منظر و پیش منظر) حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۱۳
۵۱۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکینکی مطالعہ، ص:۶۱
۵۲۔ شہزاد منظر، جدید اُردو افسانہ، منظر پبلیکشنز، ۱۹۸۲ء، ص:۶
۵۳۔ اصغر علی انجینئر، ترقی پسند ادب نظریاتی بنیادیں (مضمون) مشمولہ، ترقی پسند ادب کا پچاس سال سفر، قمر رئیس، پروفیسر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص:۹۱
۵۴۔ اقبال مجید، مشرقی ترقی پسند (تبصرہ) مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، قمر رئیس، پروفیسر، ص:۱۴۳
۵۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، ص:۱۱۵
۵۶۔ پروفیسر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو ادب کے افسانوی اسالیب، ص:۹۱
۵۷۔ انور سیدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، ص:۵۰۷
۵۸۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص:۱۸۲
۵۹۔ حیات اللہ انصاری، شکستہ گنگورے (افسانہ) آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی، ۱۹۵۵ء، ص:۱۲۴

۶۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، ص:۴۷۶

۶۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص:۱۰۴

۶۲۔ راجندر سنگھ بیدی، لاجونتی (افسانہ) مشمولہ، اپنے خواب مجھے دے دو، مکتبہ، جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص:۷

۶۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص:۹۸

۶۴۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص:۱۲۷

۶۵۔ شکیل الرحمٰن، منٹو شناسی، پاکیزہ آفسیٹ، پٹنہ، ۱۹۹۷، ص:۸

۶۶۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، کرشن چندر ایک جائزہ (تنقیدی مطالعہ) مشمولہ، کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ (مرتب) مشرف احمد نفیس اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۸۱ء، ص:۱۵۳

۶۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص:۱۶۰

۶۸۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص:۱۲۲

۶۹۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، ترقی پسند افسانہ (مضمون) مشمولہ، ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر (مرتبین) قمر رئیس، پروفیسر، سید عاشور کاظمی، ۱۹۸۹ء ص:۳۳۵

۷۰۔ اوپندر ناتھ اشک کونپل، مکتبہ اُردو لاہور، ۱۹۴۰ء، ص:۳۵

۷۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، ص:۱۳۶

۷۲۔ ایضاً، ص:۱۳۷

۷۳۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص:۱۸۸

۷۴۔ شکیل الرحمٰن، منٹو شناسی، پاکیزہ آفیٹ پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص:۷

۷۵۔ سعادت حسن منٹو، نیا قانون (افسانہ) مشمولہ، منٹو کے افسانہ، انجمن ترقی اُردو، لاہور، ۱۹۴۱ء ص:۱۰

۷۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، ص:۲۴۳

۷۷۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، ص:۸۵

۷۸۔ محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء ص:۱۷۵

۷۹۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص:۱۹۶

۸۱۔ شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء ص:۱۴۹

۸۱۔ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۷

۸۲۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو داستانے میں اسلوب اور تکینک کے تجربات، ص:۲۰۱

۸۳۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکینکی مطالعہ، ص:۸۲

۸۴۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو داستانے میں اسلوب اور تکینک کے تجربات، ص:۳۱۶

۸۵۔ محمد الیاس (انٹرویو) از صائمہ میر، بحریہ ٹاؤن راولپنڈی، ۲۸ جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۲:۳۰

۸۶۔ ایضاً

۸۷۔ ایضاً

۸۸۔ ایضاً

۸۹۔ محمد ارشد نعیم، محمد الیاس ایک فطری افسانہ نگار (تبصرہ) مطبوعہ، گل بدن سہوان بدایوں، یوپی انڈیا، ۱۹۹۸ء، ص:۵

۹۰۔ محمد الیاس (انٹرویو) از صائمہ میر، بحریہ ٹاؤن، راولپنڈی، ۲۸ جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت ۱:۰۰

۹۱۔ تزئین تاباں، اہلیہ محمد الیاس (انٹرویو) از صائمہ میر، بمقام بحریہ ٹاؤن راولپنڈی، ۲۸ جولائی، ۲۰۱۹ء

۹۲۔ سید مسعود اعجاز بخاری (انٹرویو) از صائمہ میر، تھری ڈی نانگی، میر پور ۱۵ اگست، ۲۰۱۹ء

۹۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر (انٹرویو) از صائمہ میر، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، ۹ جولائی، ۲۰۱۹ء بوقت ۱۱:۴۵

۹۴۔ منیر یزدانی، پروفیسر، (انٹرویو) از صائمہ میر، پوسٹ گویجویٹ کالج، میر پور، ۷ اکتوبر، ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۱:۰۰

۹۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر (انٹرویو) از صائمہ میر، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، ۹ جولائی، ۲۰۱۹ء بوقت ۱۱:۴۵

۹۶۔ سید مسعود اعجاز بخاری (انٹرویو) از صائمہ میر، تھری ڈی نانگی، میر پور ۱۵ اگست، ۲۰۱۹ء، بوقت: ۴:۱۵

۹۷۔ راضیہ شمشیر، کچھ منظر پس غبار کے بارے میں (تبصرہ) مشمولہ، منظر پس غبارہ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص:۱۰

باب دوم:

''لوحِ ازل پر لکھی کہانیاں اور مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''
میں سماجی حقیقت نگاری کی مختلف صورتیں

الف۔ ۹۰ کی دہائی کے بدلتے تناظر میں سماجی حقیقت نگاری کی صورتحال

کسی بھی معاشرے میں چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اگر اُس معاشرے میں پائے جانے والے تمام لوگوں کی زندگی کا اصول اعتدال و توازن پر مبنی ہو گا تو ہی وہ معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہو گا اور ایک صحت مند معاشرہ بھی کہلائے گا۔ اگر اِس اصول سے انحراف کیا جائے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس معاشرے نے اپنے لیے کوئی اور راہ چُن لی ہے جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کُچھ نہیں۔ جن معاشروں میں جنگل کا قانون نافذ ہو جائے وہاں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم پاکستانی معاشرے کی بات کریں تو ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کبھی کوئی قیادت ایسی نصیب نہ ہو سکی جو اعتدال و توازن پر قائم ہو اور دوسروں کی بھی اِس طرف راہنمائی کر سکے۔

زیرِ تحقیق مقالے میں باب نمبر ۲ میں شامل دو افسانوی مجموعوں کا تعلق ۹۰ کی دہائی سے ہے اس لیے بطورِ خاص ۹۰ کی دہائی کے بدلتے تناظر کا جائزہ لیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ اِس دہائی میں کون سی اخلاقی قدریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں اور اُن کی وجوہات کیا تھیں۔

۹۰ کی دہائی سے پہلے کی بات کی جائے تو یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ضیاء اور بھٹو کے دور میں بد عنوانی کا تحفہ پاکستانی عوام کو پہلے ہی مل چکا تھا۔

ڈاکٹر محمد افضال بٹ کی رائے میں:

> ''۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں جو صورتحال تھی وہ اصل میں ماضی سے وابستہ ہے۔ قیامِ

پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان کے سیاسی حالات ہی ایسے رہے کہ اچھے حکمران نہ
نصیب ہو سکے جو عوام کی خوشی، فرحت و مسرت کے لیے فیصلے لیتے"(۱)

۹۰ کی دہائی میں نواز حکومت اور پیپلز پارٹی کی حکومت تھوڑے عرصے کے لیے آتی رہیں۔ انہوں نے بظاہر تو جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی تھی مگر وہ نام نہاد جمہوریت لوگوں کو دو وقت کی روٹی اور ذہنی سکون نہ دے سکی۔ اصل جمہوریت تو وہ ہوتی ہے جو اِنسان کی زندگی کو سنوارنے کا ذریعہ بنے سیاسی کارکنوں اور عوام کی سوچ کا ذریعہ بنے۔ عوام اور معاشرے کے اتحاد کا ذریعہ ہو۔ سیاسی بڑے اداروں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہو۔ مگر یہ جمہوریت ایسی نہ تھی۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

"جمہوری نظام کے جدید تجربے میں اہلِ پاکستان جس اذّیت اور کشاکش سے گزر رہے
ہیں۔ سرمایہ اور طاقت بڑے پیمانے پر مؤثر اور فیصلہ کُن مقام حاصل کر چکے ہیں"(۲)

اِن جمہوری حکومتوں کا یوں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بننا اور ٹوٹنا ملک کی استقامت کے لیے بہت بڑے خطرے کا باعث بنا۔ نیز اِن کے تھوڑے وقت کے لیے آنا بھی پاکستانی عوام کے لیے کسی طرح سود مند ثابت نہ ہوا ۹۰۔۱۹۸۹ء تک کا عرصہ ایسا دور تھا کہ جب اُس وقت کے وزیر اعظم نے سرکاری خزانے کو صرف اپنی دولت سمجھتے ہوئے ناجائز مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ ایک اندازے کے مطابق ۸۹۔۱۹۸۸ء اور ۹۰۔۱۹۸۹ء کے عرصے میں قومی خزانے کو ۹ کروڑ ۵ لاکھ کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اور اِس نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے پاکستانی قوم کو ٹیکس اور مہنگائی کی صورت میں بھگتنا پڑا جب کہ اِس نقصان کی وجہ بننے والے صاف سُتھرے ہو کر باہر نکل گئے۔ سارا ملبہ ہمیشہ کی طرح عوام پر گرا، اِس سلسلہ میں مجاہد حسین کا لکھتے ہیں:

"بے نظیر بھٹو نے قوانین و قواعد کی خلاف ورزی کی۔ بے نظیر کی ناجائز، جانبداری،
اقربا پروری، دانستہ بد انتظامی اور اختیار و حیثیت کا ناجائز استعمال سب ظاہر ہے"(۳)

عوام کے پیسے پر خود عیاشی کی زندگی گزارنا اِن کا معمول بن گیا۔ زرداری ہاؤس، بلاول ہاؤس کی یہ سب چیزیں اِن کرپٹ عناصر کی بد عنوانی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نواز حکومت کا فلسفہ حکمرانی بھی ان سے الگ نہ تھا۔ اُنہوں نے بھی لالچ اور حرص کی انتہا کر دی۔ ملکی فنڈز کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ اپنے جاننے والوں کو نوازا گیا تا کہ "حلقہ اثر" وسیع سے وسیع تر ہو تا چلا جائے۔ اِن ہی کی وزارت کے دوران ۱۹۸۸ء میں پنجاب کے

مختلف محکموں میں ۳۹۳ ملین روپے کا گھپلا کیا گیا۔ پاکستان میں تو انہوں نے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے غیر قانونی زمینیں بنائی۔ لیکن ساتھ ساتھ بیرونِ ملک بھی مہنگے سے مہنگے فلیٹس خریدے گئے۔ حکمران خود تو زندگی کی ہر آسائش کا مزہ چکھتے اور غریب عوام کو بے یار و مددگار تپتے صحرا میں چھوڑ دیتے۔ آپس کی رنجشوں اور رقابت کی دوڑ میں اپنے ملک کے مفاد و ترقی کو اُنہوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ بظاہر تو مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے دور میں عوام کو خوبصورت خواب دکھانے کے لیے پالیسیاں اور منصوبے تو بنتے رہے جن پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ سیاست میں نااہل حکمرانوں کے ساتھ ساتھ کرپٹ عناصر بھی حکومت میں شامل ہوتے گئے۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح پاکستان کے خزانے کو لوٹنے کی کوشش میں لگا رہا۔ بدکردار حکمران عوام کی دولت سے اپنے اکاؤنٹ بھرتے گئے۔ زیادہ سے زیادہ کے لالچ میں غریب عوام کا خون چُوستے رہے۔ جب ملک کا دیوالیہ نکل گیا تو باہر سے قرضے لیے جانے لگے۔ نتیجتاً ملک کی معاشی و اقتصادی حالت کنگال ہو کر رہی گئی۔ غیر ممالک قرضے کے بہانے پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ بقول نور سلطان نذر:

> ”پاکستان نے ہمیشہ اُلٹے پاؤں سفر کیا ہے اور ملک کی بجائے اِس کے حکمران طبقوں نے ترقی کی ہے۔ پاکستان ۵۲ ارب ڈالر کا مقروض ہے جب کہ صرف تین عشروں میں اِس کے بدعنوان حکمرانوں اور سرمایہ داروں نے ۷۵ ارب ڈالر لوٹ کر بیرونِ ملک منتقل کیے“(۴)

اسی دور میں سیلاب کی تباہی قدرت کی طرف سے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے سیاسی بصیرت کی ضرورت تھی۔ جس کی کمی نظر آتی ہے۔ لہٰذا سیلاب سے لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ملک کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ملک کی اِس غیر یقینی اور دگرگوں حالت کا اثر لوگوں کے روّیوں پر پڑنا ایک فطری عمل تھا۔ اِن روّیوں نے بدعنوانی، ناانصافی، استحصال، ظلم و بربریت جیسی برائیوں کو جنم دیا۔ ملک کے سیاسی عدم استحکام نے ناانصافی کو بہتر طور پر پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ جس سے ہر طبقے کے لوگ متاثر ہوئے۔ اِس طرح کی صورتحال میں عوام حکومت اور حکمرانوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ جس معاشرے میں ظلم کا راج ہوتا ہے وہاں لوگوں میں بھگدڑ، بے چینی، عدم تحفظ پیدا ہوتا ہے۔ اِن حکمرانوں پر اُن کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قرآن پاک میں انہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ایسے لوگ گونگے اور بہرے ہوں گے۔ جو تمام حواس ہونے کے باوجود احساسات و ہمدردی جیسے جذبات سے یکسر محروم

ہوں گے۔ دیگر ترقی پذیر ممالک میں دیکھا جائے تو اُنہوں نے ترقی کرنے کے لیے ایک حکمت عملی ترتیب دے رکھی ہے کہ ہر حکمران کو سخت احتساب سے گزرنا ہوتا ہے تو پھر ایسے ممالک میں بد عنوانی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ مگر پاکستان کا معاملہ ہمیشہ اِس کے برعکس رہا۔ حکمرانوں کا خرچہ عوام کا پیسہ تھا اور عوام غربت کے معیار سے بھی نیچے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر حکمران عوام کی خواہشات اور اُمنگوں کی بات کرتا مگر عمل ہمیشہ زیرو ہوتا۔ کارکردگی ناپید تھی۔ کیوں کہ اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی کے حوالے سے کوئی ڈسپلن، پالیسی اور کوئی معیار پیش نظر نہ رکھا گیا۔ سابقہ سیاستدانوں نے مذہبی علماء اور صنعت کاروں کو سیاست میں آنے کا موقع دے کر بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا یہی طریقہ آگے تک چلتا رہا۔ یہیں سے مذہبی اجارہ دار طبقہ عورت پر ہر قسم کی پابندی لگانے کا ٹھیکہ دار بن گیا۔ لہٰذا عام آدمی کو بھی عورت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی شہ ملی۔ صنعت کاروں کی وجہ سے جاگیر داری نظام قائم ہوا۔ اور غریب کا استحصال شروع ہوا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں بیرونِ ممالک دورے، نام نہاد جمہوریت غلط حکمتِ عملی، ہر شعبے میں کرپشن اِن تمام عوامل نے مل کر جمہوری عمل کو دھچکا دیا۔ اور ملک نہ صرف کئی سال پیچھے چلا گیا بلکہ پاکستانی عوام کے اندر بھی اخلاقی لحاظ سے کئی ایسی برائیوں نے جنم لیا جن کا سدِباب آج تک نہ ہوا اور اِس قسم کے منفی روّیے سامنے آئے جو آج تک تبدیل نہ ہو سکے۔ پچھلے پچاس برسوں سے ہمارا پاکستانی معاشرہ ایک یتیمی کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے جس میں ہر شخص انفرادی طور پر اپنے آپ کو تنہا لاچار اور بے بس پاتا ہے۔ اُن کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کرپشن کے مگرمچھوں کے ہاتھوں بے بس یہ معاشرہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ بقول بریگیڈیئر حامد سعید اختر:

> ”ہمارے سیاستدانوں کا مجموعی روّیہ غیر دانشمندانہ، غیر لچکدار اور غیر جمہوری رہا ہے۔ وہ تمام اقدام جو عوامی خواہشات کے مظہر نہ ہوں کسی بھی صورت میں قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکتے۔ اِس میں غیر یقینی صورتحال، سیاسی طوائف الملوکی، معاشی ابتری، مہنگائی اور امن عامہ کی دگرگوں حالت سے عوام براہِ راست متاثر ہوتے ہیں“(۵)

سیاستدانوں کے اِس غیر دانشمندانہ اور غیر جمہوری روّیے نے عوام کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ جہاں سوائے نقصان اور بربادی کے انہیں کچھ نہ ملا۔ ایک مسلمان اور اسلامی ملک کے سربراہان کا یہ روّیہ اِسے نہ صرف اپنے لوگوں بلکہ دوسروں کی نظروں میں بھی گِرا چکا ہے۔ بقول اے ایچ خیال:

> "پاکستان اور بدعنوانی لازم و ملزوم بن چکے ہیں..... یہ ہماری شناخت ہے اور اسی لیے آج ہمارا شمار دُنیا کے بدعنوان ترین ممالک ہوتا ہے"(۶)

اس تمام صورتحال کے علاوہ ناقص تعلیمی پالیسیاں تعلیم کے شعبے کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ پہلے سے موجود تعلیمی اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے اور بچوں کی خاص طور پر اسلامی اصولوں کے مطابق تربیت کی بجائے نئے انگریزی سکولز متعارف کرائے گئے۔ تعلیمی پالیسیوں کے حوالے سے حکمرانوں کے غیر دانشمندانہ فیصلے کا اثر براہِ راست عوام پر پڑا اور تعلیم کے معیار کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کا معیار بھی پست ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے رائے میں:

> "The history of Educational Policies in Pakistan is replete with non-consultative abrupt decisions. One such example was the nationalization of the private and missionary educational institutions by zulfiqar Ali Bhuttou in 1972. Another example of an unplanned and abrupt decision was the establishemnet of Danish Schools by Shahbaz Sharif".(۷)

زیرِ تحقیق مقالے میں چونکہ مصنف نے اپنے سماج کی حقیقت کو بیان کیا اور اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں کی نشاندہی کی ہے کیونکہ جس طرح پہلے بات کی ہے کہ کسی بھی دور کا ادیب اپنے دور سے بیگانہ ہو کر نہیں لکھ سکتا۔ وہ دور چاہے ۹۰ کا ہو، اکیسویں صدی، اُس سے پہلے یا بعد کا دور ادیب اپنے فن سے اُس سماج کی بہترین عکاسی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اِس کا مطلب ہے اُس نے اپنے پیشے کے تقاضے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اخلاق کے بارے میں جان لینا ضروری ہے۔

خلق کی تعریف:

یعنی اِنسان کی شکل و صورت کے علاوہ اِنسان کی وہ عادت جس سے اس کے اچھے یا بُرے ہونے کا پتہ چلے۔ اگر انسان کے اندر کا اخلاق معیاری، اچھا اور دوسروں کو متاثر کرنے والا ہو گا۔ تو اِس کا مطلب ہے کہ وہ ایک اچھے اخلاق والا باکردار انسان ہے۔.

مولانا محمد حفظ الرحمٰن ''اخلاق'' کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''کسی ارادہ کا عادت بن جانا یعنی ارادہ کسی شے کا خُوگر ہو جائے تو اِس خوگر ہو جانے کو خلق کہتے ہیں''(۸)

جبکہ سیّد ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> ''خلق انسان کی اُس عادت کا نام ہے۔ جس کا اظہار بلا تکلّف ہوتا ہے۔ خُلق اِنسان کے مجموعہ اعمال کا نام ہے''(۹)

اسی طرح حضرت مولانا حکیم محمد صادق کا کہنا ہے:

> ''خلق باطن شکل و شبیہ کو کہتے ہیں اور باطن شکل و شبیہ سے مُراد سبھاؤ، برتاؤ، خصلت، عادت، سیرت، طبعیت، مزاج، وصف، سلیقہ، تمیز، شعور کے ہیں۔ جب تک انسان کے یہ باطنی اوصاف درست، صحیح اور اعتدال پر نہ ہوں۔ اِنسان کو انسانیت زیب نہیں دیتی''(۱۰)

اِن تمام تعریفوں سے پتہ چلتا ہے کہ خلق یا اخلاق انسان کے مجموعی اعمال کا نام ہے۔ جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ ان مجموعی اعمال میں اس کی عادت، طریقہ، مزاج، سیرت سبھی چیزیں آجاتی ہیں اور جب وہ اِن باطنی اعمال کو ظاہری طور پر برتتا ہے تو اُس کا اخلاق لوگوں کے سامنے آتا ہے وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ کیوں کہ اچھے اخلاق سے معاشرہ صحت مند بنتا ہے اور بُرا اخلاق معاشرے کے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔

اخلاق کا متضاد لفظ بد اخلاق استعمال ہوتا ہے۔ جس کو رذائل اخلاق یا اخلاقِ ذمیمہ کہا جاتا ہے۔ فارسی میں رزائلِ اخلاق کے لیے لفظ شنیع استعمال ہوتا ہے جس کا مفہوم مختلف جگہ اِس طرح بیان ہوا ہے۔
وارث سرہندی کے بقول:

"لفظ شنیع سے مُراد: خراب، بُرا، بدکار، بدکردار بدفعل وغیرہ"(۱۱)

جب کہ اسی طرح فارسی فرہنگ میں اِس کا مفہوم ہے:

"شُنیع سے مُراد، بُرا اور خراب"(۱۲)

شُنیع کا جمع شُنیعہ ہے، محمد امین بھٹی لکھتے ہیں:

"لفظ شُنیعہ سے مُراد ہر وہ بات جو قابلِ مذمت ہو"(۱۳)

یعنی "شُنیع" سے مُراد قابلِ نفرت فعل یا عمل ہے۔ جسے بُرے اخلاق کا نام دیا گیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے قطعاً پسند نہیں کیا۔ لیکن اگر اِس کے باوجود جو لوگ اِن بُرے اخلاق کے مرتکب ہوتے ہیں تو گویا وہ اللہ اور اُس کے رسول کے گنہگار ٹھہرتے ہیں۔ کیوں کہ اِن کے اعمال کی وجہ سے پوری معاشرت تباہ ہو جاتی ہے اور ایسے معاشرے پر ترقی و خوشحالی، سعادت و برکت کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم میں تمام کے تمام لوگ اچھے یا پھر سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ لیکن کسی بھی قوم میں بگاڑ کے ابتداء چند افراد سے ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کا ضمیر زندہ ہے تو اِن بگڑے ہوئے عناصر کا قلع قمع ہو سکتا ہے مگر قوم کے لوگ اگر اس سلسلے میں لاپرواہی اور تساہل پسندی کا مظاہرہ کرنے لگیں تو آہستہ آہستہ پوری قوم اور پورا معاشرہ اِس خرابی و بداخلاقی کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

اخلاقیات ریاست کے بارے میں تعلیم ہے۔ ایک خاص معاشرے میں اقدار، معاشرتی اور اخلاقی اصولوں پر متفق ہونے کے معیار اور اخلاقی طریقہ کے بارے میں تعلیم ہے۔ اخلاقیات معاشرتی انسان کی ایک خصوصیت ہے۔ اخلاقیات کو خاندان اور معاشرے کے ذریعے بڑھایا جاتا ہے۔ فلسفہ میں اخلاقیات اجتماعی شناخت سے وابستہ ہے جو انفرادیت کے عمل کا حِصّہ ہے۔

ماہرین اخلاقیات نے اخلاق انسانی کی کئی اقسام بیان کی ہیں۔ تمام فلاسفر اور پیغمبروں نے اخلاقیات کا درس دیا ہے۔ اُن کی تحریروں کا بنیادی نکتہ فلاح انسانیت ہے۔ انسان کی خدمت اور عظمت تمام خدائی اور انسانی نظام ہائے فکر کی بنیاد ہے سیاسی اخلاقیات ہوں یا اقتصادی اخلاقیات، سماجی اخلاقیات ہوں یا مذہبی اخلاقیات اِن تمام کا تعلق انسانی سماج کی بہتری سے ہے۔ اسی لئے سماجی اخلاقیات کے اردگرد تمام مکتبہ ہائے فکر محوِ گردش ہیں۔ جس معاشرے میں انسان کی عظمت کا تصوّر ناپید ہو وہ حیوانی معاشرہ ہے۔

اخلاقیات کے بغیر کوئی اجتماعیت قائم نہیں ہو سکتی کوئی معاشی نظام بن سکتا ہے نہ سیاسی نظم وجود میں آسکتا ہے۔ قانون کی بنیاد بھی کسی نہ کسی نظام اخلاق پر ہوتی ہے۔ یہی نہیں ایک گھر میں چند افراد کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے، اگر وہ ایک نظام اخلاق کو نہیں مانتے۔ ایک فرد جس کی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں وہ صداقت، دیانت، ہمت، وفاداری، انصاف، احترام اور ہمدردی جیسی خصوصیات کو ظاہر کرے گا۔

اخلاقیات اخلاقی خمیر ہے جو اخلاقیات کی تین اقسام پیدا کرتا ہے۔ معاشرتی اخلاقیات ، عوامی اخلاقیات اور شہری اخلاقیات۔

معاشرتی اخلاقیات: یہ اپنے آپ کو اجتماعی گروہوں اور معاشرتی برادریوں میں ظاہر کرتی ہے۔

عوامی اخلاقیات: عوامی اداروں کو منظم کرتی ہے۔

شہری اخلاقیات: سیاسی جماعت کو منظم کرتی ہے۔ اخلاقیات پیدا کردہ معاہدوں کے ذریعے اخلاقی ضابطہ اخلاق تشکیل دیتی ہیں لیکن اس کا انحصار اس رشتے پر ہوتا ہے کہ ہر فرد دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی فرد کو اخلاقی طور پر تعلیم دینے کا واحد طریقہ خاندان اور معاشرے کی کھلی اور معروضی تعلیم ہے۔

عوامی خدمت میں اخلاقیات کا معاملہ براہِ راست اِن عہدیداروں کے طرزِ عمل سے وابستہ ہے جو سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ ایسے افراد کو اخلاقی نمونوں کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اخلاقی اقدار جیسے نیک نیتی، اور معاشرے میں صحت مند زندگی کے لئے ضروری دیگر اصولوں کو ظاہر کرتے ہوئے جب کوئی فرد عوامی عہدے پر منتخب ہوتا ہے تو معاشرہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔ لہٰذا اس شخص کو اعتماد کی اسی سطح پر ہونا چاہیے اور کچھ اقدار، اصولوں اور نظریات کے بعد اپنے فنکشن کو استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طرح عوامی خدمت کے کارکنوں کو شہریوں کے ساتھ اخلاقی اور معاشرتی عزم کو یقینی بنانا ہوگا۔

اِن تمام اخلاقی نظام کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک صالح نظام اپنی منطقی انجام تک لے جانے میں کارگر اور مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس کے پاس اعلیٰ اخلاق اور زندگی کے رہنما اصول موجود ہیں۔ جو اللہ کے نازل کردہ ہیں۔ اگر حکومت بدکردار اور بد اخلاق لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو زندگی کی گاڑی حادثہ کا شکار ہو گی۔ کسی بھی معاشرے میں اخلاقیات سے روگردانی کرنے والے زندگی اور دین کے حقیقی تصور کو پا نہیں سکتے۔ اور نہ ہی اس کی تلافی نمازوں اور روزوں سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے اگر افراد یا اقوام کی اخلاقی حالت بگڑ جاتی ہے تو مشیتِ الٰہی اُسی انداز سے اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں جن چیزوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے وہ ہیں خدا سے بے خوفی، اللہ کی ہدایت سے بے نیازی، خود غرضی، جمود یا بے راہ روی، اس کے برعکس معاشرے کو مستحکم کرنے کے لئے بھی جو چیزیں ضروری ہیں وہ ہیں خوفِ خدا، خدائی ہدایت کی پیروی، نظامِ انسانیت کا اجراء، عملِ صالح۔ اِن اصولوں کو بروئے کار لا کر انسان بدلاؤ کی اُمید، ماحول میں یکسانیت اور اخوت اور انصاف پیدا کر سکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد عبد القادر عمادی:

> ”سماج میں ایسے افراد کی بھی خاصی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے جو سماجی طرزِ زندگی سے اپنے مفادات کے لیے انحراف کرتے ہیں۔ اِنسان کی فطرت میں سہل پسندی، خود غرضی، لالچ اور مفاد پرستی کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی تکمیل کے لیے بعض لوگ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ جن سے اِن کے مفادات کی تکمیل تو ہو جاتی ہے لیکن اِن مفادات کے حصول کے مروّجہ قاعدوں اور اقدار کے خلاف عمل کرتے ہیں“(۱۴)

گویا اسلام میں جو طے شدہ اخلاقی حدود و معیار ہیں جب کوئی بھی معاشرہ اُن حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارے یا اپنی غرض و غایت پوری کرے گا۔ تو یہی اُس کے اخلاق کے زوال کی نشانی ہے۔ اخلاقیات کو اسلام میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اسلام کے آنے کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے اخلاق کی اصلاح کی جائے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے جہاں اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور حسنِ اخلاق کا حکم دیا وہاں اخلاقِ ذمیمہ سے اجتناب کا بھی حکم فرمایا تا کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بھی کردار سازی ہو سکے۔ رذائل نہ صرف ایک شخص کے اعمال کو ضائع کرتے ہیں بلکہ اُس کے کردار کو بھی خراب کرتے ہیں۔

مثلاً جھوٹ، دورُخاپن، حرص اور ظلم وغیرہ۔ ہمارے اسلامی معاشرے کی بنیادیں تواُس وقت رکھی گئیں جب پوری دنیا جہالت اور نادانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اخلاق نام کی کوئی چیز اُن کے اندر موجود نہ تھی۔ حضور ﷺ نے آکر اپنے اخلاقِ حمیدہ سے اُن کی زندگیوں کو منوّر کیا۔ قرآن سے اُن کے سینوں کو روشن کیا۔ تو پھر کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم اپنے اسلاف و صحابہؓ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مدینہ کی ریاست جیسی مثال قائم کرتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جو نہی وقت گزرتا جارہا ہے ہم اپنے اسلاف و اصحابؓ کا سبق بھولتے جارہے ہیں۔ اور ایک نئی ڈگر پر چلنا شروع کر دیا ہے اور ہماری تعلیمات دوسروں کے لیے سبق بن رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ اِن برائیوں کی وجہ سے دیمک زدہ ہو گیا ہے جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہو کر ختم ہونے کو ہے۔ ان برائیوں نے ہر شخص کے اندر زہر گھول دیا ہے اور اپنا اتنا اسیر کر دیا ہے کہ لوگوں میں کھرے کھوٹے، گناہ، ثواب کی تمیز باقی نہ رہی۔ خود غرضی، نفع و نقصان کی اِس سوچ نے دوسروں کو بھلا ہی دیا ہے اور جب تک یہ صورتحال بدل نہیں جاتی معاشرے کی حالت اعتدال پر نہیں آئے گی۔

بقول ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی:

> ”دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دلوں کا چین چھن چُکا ہے۔ ہماری زندگیوں میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں اطمینان ہم سے کوسوں دور ہے۔ اخوت و مساوات ناپید ہو چکی ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ ایک دن یہ دُنیا جہنم کا ٹھکانہ بن جائے گی“(۱۵)

مسلمان تقریباً ایک ہزار سال تک دُنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت رہی تھی۔ کیوں کہ جس کتاب کو اِن کے لیے راہِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ وہ ان کی زندگی کا حصہ تھی۔ یہ محض کتاب نہیں بلکہ خدا کا میزان ہے لیکن کچھ عرصہ سے ہم نے اسے اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب و سنت سے دُوری کی وجہ سے انسان مادیّت پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور فتنے و فساد، ظلم، ناانصافی پھیلی، رشتے ناطے ٹوٹے مذہبی منافرت پھیلی، دوستی دُشمنی میں بدلی، دُنیا کی محبت اور مال و دولت کا لالچ بڑھ گیا۔

مذہب سے وابستگی، ملک سے وفاداری اور قانون کا احترام ایک انسان کے اچھے کردار کی پہچان ہے۔ جب آپ ایک باکردار انسان بن جائیں گے تو پھر اپنی ذات کے محور سے نکل کر ادارہ، ریاست اور عوام و معاشرے کی بہتری کے لیے کام کریں گے۔ اپنے معاشرے و سماج کی بہتری و ترقی کے لیے ہر شخص کو اپنی

زندگی میں ایمانداری، صبر وبرداشت، انصاف جیسے اصولوں کو اپنانا ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ عوام حکمرانوں کا ہی عکس ہوتے ہیں۔ لٰہذا ہمارے حکمرانوں کے اعلیٰ اخلاقی معیار کا پیمانہ جتنا وزنی ہو گا۔ اُس کا اثر معاشرے میں دکھائی دے گا۔ سماجی تعلقات و معاملات میں بہتری آئے گی اور وہ معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہو گا۔ دین اسلام کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنے انفرادی و اجتماعی اخلاق کو اپنے دین کے سکھائے ہوئے اصول کے مطابق کرے۔

اخلاقی زوال کی ایک بڑی وجہ اخلاقی تربیت سے شدید غفلت پر تنا بھی ہے ہم اپنے بچوں کو دولت، شہرت اور اچھے مستقبل کا سبق تو دیتے ہیں مگر اچھی تربیت کی کمی چھوڑ دیتے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جھوٹ، بد دیانتی، غبن، ملاوٹ، استحصال، منافقت معاشرے میں اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ بنی اسرائیل کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اُن کے بھی یہی جرائم تھے جس کی بنا پر اللہ نے اُن پر لعنت برسائی۔

اگر ہمارا معاشرہ انحطاط و زوال کی اِس حالت سے نکلنا چاہتا ہے تو جدید ٹیکنالوجی کام آسکتی ہے۔ نہ زیادہ دولت، نہ جہاد و قتال نہ ہی مزاحمت کی تحریکیں۔ اِس حالت سے نکلنے کے لیے وہ اسباب ڈھونڈ کر اُن کا سدِّ باب کرنا ہو گا جو اِس اخلاقی زوال کی وجہ بنے۔ ورنہ یہی ذِلّت و محرومی ہمارے معاشرے کا مقدر رہے گی۔ مصنّف نے اپنے ان دو افسانوی مجموعوں "لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں" اور "مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں" میں جس سماجی حقیقت اور اخلاقی زوال کی صورتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ درج ذیل ہیں:

i.	بدعنوانی	ii.	استحصال
iii.	بے حسی	iv.	منافقت

i. بدعنوانی:

علمی اُردو لغت میں بدعنوانی کا مفہوم ہے:

"ہیرا پھیری کرنے والا، رشوت خور، بدقماش، بداطوار" (١٦)

یعنی بدعنوانی اخلاقی یا روحانی نجاست ہے۔ معیشت میں بدعنوانی ایسی خدمات یا مواد کا حاصل کرنا جس کا وہ حق دار نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بد عنوانی کئی طرح کی ہوتی ہے رشوت لینا بد عنوانی کے زمرے میں آئے گا۔ اگر کوئی شخص رشوت لیتا ہے تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے کیوں کہ رشوت کو اسلام میں بہت بڑا جُرم سمجھا جاتا ہے۔ پھر اسی طرح اگر کوئی شخص دولت یا عہدہ کے حصول کے لیے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے پھر اپنے عہدے اور دولت کا غلط استعمال کرتے ہوئے اسلامی و ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ بھی کرپٹ اِنسان کہلائے گا۔ بد عنوانی کے لیے انگلش میں کرپشن (Corruption) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں بد عنوانی نظر آتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں سیاست، پولیس اور صاحب اختیار و صاحبِ اقتدار کے ہاں اِس کی مثالیں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔

i. سیاست میں بد عنوانی:

سیاسی بد عنوانی سے مراد سیاسی طاقت یا پھر اپنے وسائل یا عہدے کا غلط استعمال ہے۔ جو صرف اور صرف ذاتی فائدے کے لیے استعمال کیے جائیں۔ حکمران ایک ایسا نائب ہوتا ہے جسے لوگوں کی ذمہ داری کے لیے منتخب کیا جاتا ہے مگر یہی حکمران نیابت سنبھالنے کے بعد اپنی اُس ذمہ داری میں خیانت کرتے ہیں اور ملکی اور عوامی وسائل سے اپنی زندگی کو آسودہ بناتے ہیں۔

ii. پولیس کے محکمے میں بد عنوانی:

پولیس کی بد عنوانی یہ ہوگی کہ وہ اپنی وردی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو تحفظ دینے کی بجائے اور امن و سکون پیدا کرنے کی بجائے بے چینی، افراتفری اور پیدا کرتے ہیں۔ مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے قانون کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

iii. معاشرے کے دیگر صاحب اختیار لوگوں میں بد عنوانی:

جس معاشرے میں قانون کی گرفت مضبوط نہ ہو، وہاں ہر شخص من مانی کرتا نظر آتا ہے۔ صاحب حیثیت لوگ اپنا کوئی بھی کام دو نمبر طریقے سے کروالیتے ہیں اور اپنے اسی پیسے کی بناء پر وہ غریبوں کو دبا کر ہر کام نکلوالیتے ہیں۔ کرپشن کی اس لعنت میں صرف یہی لوگ نہیں بلکہ کچھ درمیانے یا غریب طبقے کے لوگ بھی ملوث ہوتے ہیں۔ مثلاً غریب غربت سے تنگ آکر رشوت لیتا ہے یا پیسوں کے لیے کسی بڑے کا غیر قانونی کام کر دیتا ہے۔ گویا پوری کی پوری قوم دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ اِس برائی میں ملوث نظر آتی ہے۔ زیر تحقیق

اِن مجموعوں میں ہمیں سیاست، پولیس، معاشرہ کے صاحب اختیار سب کے ہاں بد عنوانی نظر آتی ہے۔ کرپشن اِنسانی ہلاکت کا باعث ہے۔

''فرشتے'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انسان کی اُس جبلّت وعادت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہر گناہ کو ثواب سمجھتا ہے اور غلطیاں اور خرابیاں انھیں صرف دوسروں میں نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگ زندگی کا دوہرا معیار رکھتے ہیں۔ خود زندگی کا عیش حاصل کرنے کے لیے ہر ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں اور دوسروں کے سامنے ایک باوقار زندگی کا ڈھونگ رچاتے ہیں مگر بہ نظرِ عمیق اِن کی سوچ اور کارنامے کچھ اور ہی رنگ دکھا رہے ہوتے ہیں۔ مگر اِن سب کے باوجود معاشرہ انہیں عزت و احترام کا مقام دیتا ہے نیز کارکنانِ حکومت اور نافرض شناس اہل کار اکثر اِن کے گناہوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

افسانے میں ایک ہی کردار ہے جس کا نام جاوید مرزا ہے جو بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ سواری کے لیے مرسڈیز کے علاوہ کسی اور گاڑی میں بیٹھنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات بنا رکھے ہیں۔ حالانکہ گھر میں ایک نیک پاک باز بیوی جو کہ مولوی قدوس کی بیٹی ہے بھی موجود ہے۔

سرکاری عہدے پر متمکن ہونے کے باوجود ہر ناجائز کام کرتا ہے مگر سیاست کے کارندوں پر ہمیشہ کڑی تنقید کرتا ہے اور ملکی حالات کا ذمہ دار صرف اور صرف انہی لوگوں کو ٹھہراتا ہے۔ مہنگائی کا رونا روتا ہوئے اس کو یہ شکایت ہے کہ اب عورتوں کے ساتھ زندگی کا مزہ لوٹنے اور بیرونِ ملک کی بجائے صرف مری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مصنف نے افسانے میں منافق اور چیرا دست لوگوں کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ جو عورت اس کے ساتھ مری وقت گزار کے آرہی تھی اُسے بولا:

> ''ہماری حالت بہتر ہونے کی بجائے دن بہ دن خراب ہوتی جارہی ہے۔ مرسڈیز سے کرولا پر آگیا ہوں۔ کابل کی مارکیٹ ہاتھ سے ہی نکل چکی ہے.....پہلے میں ہر سال کم از کم دو چکر باہر کے لگایا کرتا تھا۔ ہانک کانگ اور بنکاک کا سفر میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے گوجرانوالہ''(۱۷)

راستے میں آتے ہوئے پولیس والوں نے روکا تو بولا:

''کیا بات ہے بھئی! کیوں اس طرح سے روکا ہے؟ چور ہیں ہم کہ ڈاکو؟ تم صرف شرفا پر

ہی رعب گانٹھنے کے لیے رہ گئے ہو؟ ہٹاؤ آگے سے اسے ..... کوئی غیر عورت ہے میرے ساتھ؟ کُچھ فاصلے پر کھڑے اے۔ ایس۔ آئی نے نظر بھر کر گاڑی اور اِس کے مالک کو دیکھا اور پھر قدرے متذبذب انداز میں اپنے ماتحت عملے کو ہاتھ کا اشارہ کر کے سڑک پر آتی ہوئی دوسری گاڑیوں کی طرف متوجہ کیا۔ عملے نے چپکے سے گاڑی کو نکلنے کا راستہ دے دیا"(۱۸)

فرشتوں جیسی صفات رکھنے والے اِنسان دُنیا میں بہت کم ہیں مگر شیطانی صفات رکھنے والے اس دنیا کے چپّے چپّے پر موجود ہیں۔ ایسی ہی بات زیرِ نظر افسانہ "فرشتہ" میں نظر آتی ہے۔ بقول محسن بھوپالی:

"فرشتے اعلیٰ معاشرے کے ایک بد عنوان کردار کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے"(۱۹)

بقول لطیف کاشمیری:

"فرشتے مراعات یافتہ بزنس مین طبقے کی نفسیات ان کی مدمستیوں اور ان کے پسندیدہ مشاغل کی نقاب کشائی کرتا ہے"(۲۰)

افسانہ "ڈوگرہ" میں ہمارے معاشرے میں موجود مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا گیا ہے یہ مکروہ چہرے ہر جگہ نظر آتے ہیں لوگ دولت اور شہرت کے پجاری بن کر جائز و ناجائز کی تمیز بھول جاتے ہیں۔ دولت کی ہوس نے ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کو اتنا گرا دیا ہے کہ لوگوں کے اندر سے احساسِ ندامت بھی جاتا رہا۔

یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو خود تو اتنا بُرا نہیں مگر اپنے گھر والوں کی تنقید اور لعن طعن سے تنگ آکر دولت مند بننے کا مصمّم ارادہ کر لیتا ہے۔ اپنے ہی چچازاد کو دھوکا دے کر اُس کا مال اسمگل کراتا ہے۔ منشیات کے استعمال کا ایک نیا اور انوکھا طریقہ ایجاد کر کے گویا ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔

"کیمیکل انجینئرنگ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کر رکھی تھی ..... منشیات کی دنیا میں انقلابی ایجاد کر کے تاجر برادری کے علاوہ معزز صارفین کے لیے عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ اب سگریٹ کی محتاجی بھی نہیں رہی تھی..... اِس ایجاد کردہ مادے سے تیار شدہ

کاغذ کی شیٹ سے حسبِ ہمت و استطاعت مناسب سائز کا ایک ٹکڑا پھاڑیں، اسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں بڑے پیار سے رول کر کے سگریٹ کی شکل دے کر سلگائیں اور کائنات کی وُسعتوں میں کھو کر بے خودی اور ذہنی آسودگی کے وافر مزے لوٹیں"(۲۱)

چنانچہ مختلف حربوں سے کافی دولت اکٹھی کی کیوں کہ اِن کے والد صاحب کا کہنا تھا:

"بیٹا جی! فی زمانہ دولت ہی اصل طاقت ہے بلکہ طاقت کا سرچشمہ ہے وہ اپنا یہ زرّیں قول اِس قدر تواتر سے دہراتے کہ اس کے ذہن میں سے تمام فرسودہ نظریات محو ہوتے چلے گئے۔ جیسے علم بڑی دولت ہے..... اخلاقیات کے تمام اسباق اِس نے دل سے حرفِ غلط کی مانند مٹاڈالے"(۲۲)

مصنف نے افسانے میں معاشرے کے اِس روّیے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت کس انداز سے کر رہے ہیں۔ یہی وہ انداز ہے جِس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ تنزلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ والد صاحب بس اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مزید اُن کی خواہش ہے کہ اُن کا بیٹا صوبائی و قومی سطح پر عملی سیاست میں حصہ لے اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ایک سیاسی پارٹی سے ٹکٹ بھی حاصل کر لیا۔ افسانے کا یہ کردار آخر میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ محض ڈیڑھ ارب کے عوض وہ ساڑھے بارہ کروڑ افراد کو یرغمال بنالے گا تو اُس میں اور مہاراجہ گلاب سنگھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔ مگر اُس کا والد پھر سرزنش کرتا ہے کہ اُس جیسے نالائق کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

افسانے میں بتایا گیا ہے کہ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کے پاس کتنے راستے ہیں کہ وہ ملکی سیاست پر بھی چھائے نظر آتے ہیں۔ غریبوں کا حق غصب کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی نظام کو بھی تباہ کرتے ہیں۔ افسانے میں ملکی کرپشن پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد فیروز شاہ:

"ڈوگرہ پڑھ کر محمد حسن عسکری یاد آتے ہیں۔ جنہوں نے رومی فلسفے کو اِس ایک جملے کے کُوزے میں بند کر کے رکھ دیا کہ اِنسان کی اصل مصیبت اُس کی خواہشات ہیں۔ وہ کہ جن میں دولت اپنی ہوس کے سوا کُچھ بھی نہیں رہ جاتا..... اِس افسانے میں ایک

ایسے شخص کی کتھا فنّی باریکیوں کے ساتھ بیان ہوئی ہے جو کہ خوش منظر آرزو کی جستجو میں بے نمو ہو کر رہ جاتا ہے"(۲۳)

"التکاثر" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مصنّف نے معاشرے کے اُس ناسُور کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہماری عوام کی روحوں سے چمٹ گیا ہے۔ جس کا علاج آج تک دستیاب نہیں۔ بد عنوانی جیسی لعنت سے کوئی بھی معاشرہ محفوظ نہیں یہ اور اِس جیسی اور برائیوں نے اخلاق کی حدوں اور سطحوں سے بلند ہو کر ایک ایسا ہولناک منظر تخلیق کر دیا ہے جس میں لوگ غربت اور امارت کی جنگ جیتنے کے لیے کُچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ اِنسانی رشتوں کا احترام ناپید ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ لالچ، ہوس اور امارت کے اِس جنون میں تمام قانونی اور اخلاقی حدوں کو پار کر لیا گیا ہے۔

افسانے کا بنیادی کردار عجو کھڑکھنا ہے جس کا بچپن انتہائی غربت و افلاس میں گزرتا ہے۔ والد کی وفات کے بعد اس کی اور اس کے گھر والوں کی نگہداشت اِس کی سگی پھوپھی نے کی۔

"اِس کی بڑی پھوپھی سردہ بیگم نے یتیمی کے دور میں ان کے سروں پر ہاتھ رکھا۔ اس کے پاس کافی ڈنگر تھے۔ اگر اِن کی بے کسی کے اُس دور میں پھوپھی نے خیال نہ رکھا ہوتا تو وہ تینوں، بہن بھائی اور ان کی ماں فاقوں سے مر گئے ہوتے۔ پھوپھی، دودھ گھی انڈے اور مرغیاں بیچ کر کُچھ نہ کُچھ بچا لیتی..... کُچھ وہ اپنے خاوند کی مرضی سے اور کُچھ چھپا کر اُن کے لیے رکھ لیتی"(۲۴)

اپنی خواہشات کی کسی نہ کسی طرح تکمیل کے لیے بچپن سے ہی دھوکا دہی کی عادت اِس کے مزاج کا حِصّہ بن گئی تھی۔ ایک دفعہ سیلاب زدہ لوگوں کے امدادی کیمپ سے مختلف بہروپ بدل کر راشن وصول کرتا رہا۔ چھوٹے موٹے پیشے اختیار کر کے اب وہ گھر والوں کو دو وقت کی روٹی دینے کے قابل تو ہو گیا۔ مگر چونکہ ابھی بھی اپنے رشتہ داروں کے ہم پلہ نہ ہو سکا تھا۔ لہٰذا اِسے اب اپنے کمتر کہلانے پر سمجھوتہ نہ تھا۔ اب بیرون ملک جانے کی خواہش پوری کرنے کے لیے پھوپھی سے بات کی جس نے بھتیجے کے پیار میں تمام اثاثہ جات بیچ ڈالے۔ بارہ سال بیرونِ وطن میں گزارنے کے باوجود اِس کے علاقے کا چوہدری برکت ابھی بھی اِس سے آگے تھا۔ حسد اور لالچ کی آگ میں وہ ایک ایسا بھیڑیا بن چکا تھا جس نے دولت کے لیے اپنوں کو چیر پھاڑنے

میں عار محسوس نہ کی۔ پھوپھی کی جمع پونجی پر اپنا مستقبل کھڑا کرنے کی ہوس سے پیاس نہ بجھی تو بیرون ملک ہیروئن اسمگل کرنے کا ارادہ کیا۔ لہٰذا پھوپھی اور اُس کے بچوں کو حج پر روانہ کر دیا۔

"سردہ بیگم کی سمجھ میں کُچھ نہیں آرہا تھا کہ گورے اسے اتنے دنوں سے کیوں روکے ہوئے ہیں۔ جس دن سے وہ جہاز سے اترے یہ لوگ اسے یہاں بند کر گئے تھے۔ وقفے وقفے سے کچھ اجنبی صاحب لوگ آتے، ہاتھ میں لی ہوئی ایک پوٹلی اس کی آنکھوں کے قریب لا کر کچھ پوچھنے لگتے..... ہر بار ایک ہی جملہ بولتی: ہائے ہائے میں کرماں ماری حج سے رہ جاؤں گی۔ کوئی اللہ رسول کے واسطے میرے بھتیجے کو اطلاع کر دے"(۲۵)

افسانے میں مصنف نے غربت سے امارت تک کا سفر دکھایا ہے نیز اِس میں کثرت دولت کی ہوس پرستی میں مبتلا ہو کر انسانی رشتوں میں خلوص اور محبتوں کا خون ہوتے دکھایا گیا ہے۔
بقول پروفیسر فیروز شاہ:

"ہمیں کثرت کی ہوس نے مارا اور ہم مر کر بھی جینے کے راز سے ہم آواز نہ ہو سکے۔ روح مردہ ہو چکی، جسم کے جنجال میں اُلجھے لاشے بھگدڑ مچائے پھرتے ہیں۔ جانی پہچانی حقیقتوں کو دل سے نہ ماننے کی من مانی کرتے ہوئے لوگوں کے نوحے اِس افسانے کی ہر سطر میں سر اُٹھاتے محسوس ہوتے ہیں"(۲۶)

ii. استحصال:

استحصال کا مطلب ہے زبردستی حاصل کرنے کا عمل۔

"علمی اُردو لُغت میں اس کا مفہوم ہے، حاصل کرنا، حاصل کرنے کی خواہش، چھین لینا، چھین لینے کا عمل۔

استحصال بالجبر، زبردستی، چھین لینا، جبراً چھین لینے کا عمل"(۲۷)

استحصال کے لیے انگلش میں Exploitation استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے۔ "ناجائز استفادہ"

گویا استحصال کا مطلب ہُوا زبردستی دوسروں کے حقوق، مال و ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا اور اُس سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا۔ ہمارے معاشرے میں اُوپر سے لے کر نیچے تک ہر جگہ استحصال ہو رہا ہے۔ وہ چاہے حکمرانوں کا عوام کے ساتھ ہو، یا جاگیر دار اور دولت والوں کا غریبوں کے ساتھ یا مرد کا عورت کے ساتھ۔

غریبوں کو دبانے اُن کے حقوق چھین لینے کی مثال صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ اِس کے علاوہ مرد کو چونکہ طاقت اور برتر ہونے کا زعم ہے اس لیے نہ صرف باہر بلکہ گھر کے اندر بھی عورت کو ملکیت تصور کرتے ہوئے اُس کے حقوق چھین کر اُسے مجبور و بے بس بنا دیا جاتا ہے۔ یہاں شامل اِن افسانوں میں زیادہ تر غریب طبقہ اور عورت کا استحصال نظر آتا ہے۔ ہر ملک میں تین طبقے پائے جاتے ہیں۔

(i) امیر طبقہ (ii) متوسط طبقہ (iii) غریب یا نچلہ طبقہ

(i) امیر طبقہ: وہ جس کو انگلش میں Alit Class کہا جاتا ہے اور ان کے پاس ہر ضروریات زندگی موجود ہوتی ہے۔

(ii) متوسط طبقہ: وہ طبقہ جو اپنی محنت مزدوری سے ضروریات زندگی پوری کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔

(iii) غریب طبقہ: غریب طبقہ وہ جس کے پاس مال و دولت کی شدید قلت و کمی ہو۔ انگریزی میں اِس کے لیے (Poverty) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس سے مراد فرد اپنی ضروریات زندگی کو پورا نہ کر سکتا ہو۔

وارث سرہندی ''علمی اُردو لغت'' میں غربت کی تعریف لکھتے ہیں:

''غریب سے مراد عاجز، مسکین، مفلس، نادار اور سیدھا سادہ ہونا''(۲۸)

اِنسان کو زندگی گزارنے کے لیے چند حاجات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اِن بنیادی ضروریات پر انسان کا حق ہے۔ مگر معاشرے کے چند افراد صبر و اعتدال کا دامن، چھوڑ کر لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے حِصّے کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یا پھر ناجائز طریقے سے اکٹھی کی ہوئی دولت سے بنائے ہوئے مقام کو قائم رکھنے کے لیے اپنے سے نچلے طبقے کو آگے بڑھنے اور اپنا حق مانگنے سے روکتے ہیں اور اُن کا استحصال کرتے ہیں۔

غریب کا استحصال:

''ایک بٹا چھ'' ایک مختصر کہانی ہے۔ یہ کہانی معاشی ناہمواری، معاشرے کی بے رحمی، محرومی، تذلیل، بے بسی، غرض بہت سے حوالوں کے ساتھ غور و فکر کے دریچے کھولتی چلی جاتی ہے۔ کہانی معاشرے کی بے رحمی پر طنز ہے۔ جو غریب کو غربت کی چکی میں پسنے کے لیے چھوڑ کر اُس کی محرومی کا تماشا تو دیکھتے ہیں مگر ہمدردی کے دو بول کہنا یا مشکل کی اِس گھڑی میں کسی بھی قسم کی مدد کرنا شاید اُن کے فرائض میں شامل نہیں۔ ہاں غربت سے سسکتی اِنسانیت کو حقارت کی نظر سے دیکھنا ہم اپنا فرض ضرور سمجھتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایک غریب کی زندگی تماشا بن جائے تو پھر غریب ایسا ہی کرے گا جیسا کہ اِس افسانے میں ہوا۔

کہانی بھٹہ مزدوروں کی غربت اور زبوں حالی کی داستان ہے جو اُن کی زندگی کی مشکلات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ کہانی دل دہلا دینے والی ہے۔ افسانے میں ایک غریب مزدور ''بُوٹا'' اور اُس کی بیوی تمام دِن محنت مزدوری کر کے بچّوں کو روکھی سوکھی مہیا کرتے ہیں۔

> ''بُوٹا کی بیوی نے چاول اُبال لیے تو پچھ میں نمک مرچ ڈال کر بگھار لگایا تا کہ آج کچھ ذائقہ دار سالن بن جائے۔ وہ دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ چاول جیسی نعمت اس علاقے میں وافر ہے جو مزدوری سے فارغ ہونے پر جھٹ سے پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ چاولوں نے ایک طرح سے دِن کی پردہ پوشی رکھی تھی۔ رات سونے کے لیے اس کی پرالی کا بستر بنا لیتے اور ٹھنڈ سے بچنے کے لیے یہی اُوپر اوڑھ بھی لیتے''(۲۹)

زندگی کا دھڑا اِسی طرح گھسیٹتے گھسیٹتے ایک دِن بوٹے کو پتہ چلا کہ اِس کے بڑے بیٹے کا ایک گردہ تقریباً کام کرنا چھوڑ چکا ہے۔ ایک جاننے والے کی وساطت سے ہسپتال تو پہنچ گئے مگر ہسپتال والوں نے افسر کے مکمل علاج کے لیے چھ ماہ کی مدّت بتائی۔ بھٹہ ہسپتال سے دور ہونے کی بدولت دونوں میاں بیوی کو دہاڑی چھوڑنی پڑتی۔ چھ ماہ کا حساب لگا کر بُوٹے کے پیروں تلے زمین نِکل گئی۔ افسر کا ہسپتال میں بہتر علاج ہو رہا تھا بوٹے نے محسوس کیا کہ افسر کی حالت سنبھل رہی ہے مگر دہاڑیاں چھوڑنے پر بوٹے کو بہت نقصان اُٹھانا پڑ رہا تھا۔ اُس نے سوچا اِس ایک کو بچانے کے چکر میں باقی چھ کا کیا ہو گا۔

> ''اگر وہ چھ ماہ تک بے روزگار رہا تو اِس کی بیوی اور بچّے فاقوں سے مر جائیں گے۔ وہ چپکے

سے اُٹھا، افسر کو بستر سے اُٹھا کر کندھے سے لگایا اور دبے پاؤں وارڈ سے باہر نکل گیا کہ اگر افسر کا علاج نہ ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ زندہ رہے گا"(۳۰)

ایک بچّے کو زندگی دے کر وہ پورے کنبے کو زندہ در گور کیسے کرتا۔ کہانی کا اختتام قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ سیّد مسعود اعجاز بخاری لکھتے ہیں:

"ایک بٹاچھ میں مصنف نے بے حد محروم طبقے کی مجبوریوں اور مسائل ونفسیات کو بڑی خوب صورتی، مہارت اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے"(۳۱)

افسانے میں جو کچھ جس طرح سے بیان ہوا ہے وہ ہمارے سماج کی وہ حقیقت ہے جس سے ہم نظریں نہیں چرا سکتے۔

مصنّف نے سماج میں موجود غریب کے حالات کو جس جزئیات نگاری سے بیان کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اپنے حالات اور معاشرے کی تنگ نظری و تنگ دستی سے تنگ آکر انسان اپنے من کے موتیوں کو بھی قربان کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غربت انسان سے سوچنے سمجھنے، فیصلہ کرنے، نفع و نقصان اور بُرے بھلے میں تمیز کرنے کی صلاحیت چھین لیتی ہے اور بدلے میں ہر کام کر گزرتا ہے جس سے وہ پیٹ کا دوزخ بھر سکے۔

بقول ڈاکٹر محمد عبد القادر عمادی:

"خاندان بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے سماجی، معاشی اور جذباتی یا ذہنی تحفظ کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے لیکن اگر کسی خاندان کی معاشی حالت تباہ ہو جائے اور خاندان کے افراد فاقہ کشی کے حالات کا شکار ہو جائیں تو ایسا خاندان اپنے افراد کو کسی قسم کا تحفظ نہیں دے سکتا"(۳۲)

افسانہ "اغوا" میں ہمارے معاشرے میں موجود وڈیرہ و جاگیر دارانہ نظام کو موضوع بنایا گیا ہے نیز ساتھ ساتھ حکومت کے کارندوں کے اعمالناموں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن کی طاقت کے بل پر اِن لوگوں کو بھی غریب کا استحصال کرتے عار محسوس نہیں ہوتی۔ حکومت چاہے آمر کی ہو یا جمہوریت کی۔ تمام کی

تمام سیاست عوام کو دھوکا دینے، انہیں بے وقوف بنانے اور اپنی ذات اور اپنی ذات سے منسوب اِن چمچہ گیری کرنے والوں کو فائدہ پہنچانے تک ہی مرکوز ہے۔

افسانہ ''اغوا'' میں بھٹے پر مزدوری کرنے والا منظور حسین بہت ہی سادہ مزاج ایک غریب انسان ہے جو اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتا ہے کہ اب تو جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ لہٰذا بھٹے کے مالک سے اُس نے جو جو قرضے لیے ہیں وہ قرضے بھی معاف ہوں گے۔ غریبوں کی بھی سُنی جائے گی اور وہ آزادی سے کُھل کر سانس لے سکے گا۔ مگر اِس خوش فہمی میں مبتلا ہونے سے پہلے اِسے جان لینا چاہیے تھا کہ جمہوری نظام قائم کرنے کی بات بھی تو ہی کر رہے ہیں جو اپنے اعمال ناموں کی سیاہی سے پورے معاشرے کا منہ کالا کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری سیاست پر ایک خاص قسم کے گروہ کی اجارہ داری و ملکیت ہے جو ایسا ہونے نہیں دیتی۔

بقول بریگیڈیئر حامد سعید اختر:

> ''جو لوگ ملک کی جڑیں کھودنے اور بے ضمیری سے ملکی وسائل لوٹنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں بار بار وہی کرسیٔ اقتدار پر متمکن دکھائی دیتے ہیں''(۳۳)

چنانچہ ایسے لوگ کبھی یہ نہیں چاہتے کہ کبھی کوئی غریب اُن کے سامنے آزادی کی بات کرے۔ منظور حسین نئی حکومت کی پالیسیوں سے بے حد متاثر ہوا۔ لہٰذا اپنی پسندیدہ پارٹی کا جھنڈا اپنے گھر کی چھت پر لگانے لگا تو بھٹے کا مالک مخالف پارٹی کا حامی ہونے کے ناطے یہ برداشت نہ کر سکا اور منظور حسین کو واپس جھنڈا اُتارنے کا حکم سناڈالا۔ منظور حسین بڑا پُر اعتماد انداز میں بولا کہ اب تو جمہوریت ہے۔ لہٰذا اب تو ایسا ممکن نہیں تو مالک سمیت وہاں موجود تمام لوگ اُس کی سادگی کا مذاق اُڑانے لگے۔ بھٹے کا مالک بولا:

> ''اوئے دلیا! کہاں ہے جمہوریت؟ لا مجھے بھی دیدار کرا اپنی اِس بے بے کا''(۳۴)

اگر ہمارے ملک کا نظام بہتر ہو گا تو نہ یہ معاشی ناہمواری رہے گی اور نہ کسی اِنسان کو خُدا بننے کا اختیار ہو گا جس کی وجہ سے وہ غریب کی غریبی کا فائدہ اُٹھا کر اُسے زندگی کے ہر موڑ پر ذلیل و خوار کریں۔

منظور حسین کو ابھی تک یہ بات سمجھ نہ آئی کہ لوگ اُس کی اِس بات کا مذاق کیوں اُڑا رہے ہیں۔ وہ ضرور حکومت کو چوہدری کی اِس حرکت کی خبر کرے گا۔ پولیس والے سے لے کر ہر بڑے سے بڑے آفیسر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اُس نے بات کی مگر سب نے اُس کی سادگی و شرافت کا مذاق اُڑایا۔ اب کی بار چوہدری نے منظور

حسین کو کسی اور بھٹے کی طرف روانہ کر دیا اور خود اُسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا جس کا ڈنکا پورے شہر میں بج رہا تھا۔

''اغوا'' در اصل ہمارے سماج کی ہی کہانی ہے۔ جہاں آئے روز لوگوں کے ارادوں، اُن کی سوچوں، اُن کی خواہشوں اور ضرورتوں کا اغوا ہوتا ہے۔ غریب اپنی معصوم خواہشات کا جونہی اظہار کرتا ہے تو دوسرے اُسے انا کا مسئلہ بنا کر ڈنڈے کے زور پر چُپ کرا لیتے ہیں۔ گویا وہ کوئی رینگتی ہوئی مخلوق ہو جو اُوپر اُٹھنے کے لیے سر اُٹھائے اور اُسے کچل دیا جائے۔ بھٹے کا مالک یہ برداشت نہ کر سکا کہ میرے ماتحت رہنے والا بھی اپنے روشن مستقبل کے خواب دیکھے۔ چونکہ مستقبل میں چوہدری ریاست نے بھی اُس پارٹی میں شامل ہونا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے ماتحت کو یہ برابری بھی کیسے دے سکتا تھا۔

چاروں طرف منظور کی پسندیدہ سیاسی جماعت کے بینر اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ سٹیج کے پیچھے اِس کے قائدین کی قد آدم تصویریں آویزاں تھیں، باری باری کئی چوٹی کے راہنماؤں اور وزیروں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ پھر سٹیج پر پیچھے صوفوں سے اُٹھ کر چوہدری ریاست مائیک پر آیا اور بولنے لگا۔

> ''میں اپنے ہزاروں ساتھیوں اور برادری سمیت پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کرتا ہوں''(۳۵)

ہمارے معاشرے میں غاصبیت اور استحصال نے اِنسان کی بنیادی ضرورتوں کی اہمیت اور ان کی تکمیل کی نفی کی ہے اور یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ جاری ہے۔

بقول پروفیسر محمد فیروز شاہ:

> ''اغوا افسانوی سوالیہ ہے۔ مکر کی چالوں سے بازی لے جانے والے سرمایہ دار آج بھی مزدور کی سادگی کو مات دینے کے لیے نئے حربے آزماتے چلے جا رہے ہیں''(۳۶)

بقول شبنم رُومانی:

> ''سیاست کو ادب بنا دینا آسان نہیں ہے محمد الیاس کی یہ کہانی سیاسی رجحانات اور سیاسی دوغلے پن کو بے نقاب کرتی ہے''(۳۷)

اقتدار ایک ایسا نشہ ہے کہ جس کو اِس کی لت پڑ جائے تو اُس سے کسی بھی نیکی یا سیدھے کام کی توقع کرنا بیوقوفی ہے ''انا'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مصنّف نے ایک بار پھر ہمارے سماج کے سیاسی مزاج کو موضوع بنایا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر آج تک کوئی بھی حکمران ہماری قوم کو ایسا نصیب نہ ہو سکا کہ جو غریبوں کا ہمدرد ہو۔

''انا'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ہر پل غربت میں گزار رہی ہے۔ مگر کبھی کسی کے آگے دامن نہ پھیلایا اور نہ ہی اُدھار لیا۔ بلکہ محنت پر یقین رکھتے ہوئے حلال روزی کماتی رہی۔ کبھی کبھار حکومت کی طرف سے ملنے والی امداد سے اِس کے گھر بھی سامان عام دنوں سے کچھ زیادہ آجاتا تو شکر کرتی اور حکومت وقت کو دعائیں دیتی کہ کبھی کبھار تو اِن کو خیال آ ہی جاتا ہے۔

> ''پانچ چھ ماہ پہلے ممبر صاحب نے آٹے کا ایک تھیلا اور گھی کا ڈبّا بھی دیا تھا۔ اُس نے پوتی، پوتے، بہو، بیٹے کے لیے دو دو اور اپنے لیے بھی ایک پراٹھا بنایا تھا۔ پورا ہفتہ آٹے کی فکر گھر کے نزدیک نہ پھٹکی اور پہلے دن پراٹھے کھانے کے باوجود گھی پورے تیرہ دن تک چلا..... سرکار کی طرف سے ملی دونوں چیزیں اُسے بہت عزیز تھیں۔ چونکہ دونوں پر حکمران کی تصویر بنی ہوئی تھی اِس لیے محبت بھرا یہ تحفہ اُس نے نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھ لیا''(۳۸)

کارکنانِ حکومت سال میں ایک دفعہ زکوٰۃ فنڈ تقسیم کرتے وقت تصاویر اور ویڈیوز بنواتے، اخباروں میں سرخیاں لگ جاتیں اور غریب بے چارے اپنی تصویریں دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے۔

> ''بچے تصویر دیکھتے تو اُن کے مُنہ میں پراٹھے کا ذائقہ گُھلنے لگتا۔ نچلے مسوڑے کھٹے نمکین پانی میں ڈوب جاتے اور ان کے دل میں بے اختیار یہ خواہش سر اُبھارتی کہ آٹے کا تھیلا اور گھی کا ڈبہ پھر ملے، تاکہ دادی دوبارہ دو دو پراٹھے سب کو کھلائے''(۳۹)

اس غریب عورت کو بتایا گیا کہ علاقے کے ممبر صاحب مشینیں تقسیم کروانے کے لیے علاقے میں جلسہ کروانا چاہ رہے ہیں لہٰذا خوشی خوشی وہ بھی جلسے میں شریک ہو گئی۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب اُس کا نام

بولا گیا تو ممبر صاحب نے اِس کی ''انا'' اور ''غیرت'' کی تعریفیں کرنے کے بعد اُسے مشین تھمائی تو اُسے دو منٹ اُدھر ہی کھڑے رہنے کا کہا گیا۔

> ''فلیش لائٹس چمکیں۔ اِس کے چہرے پر بہت تیز روشنی پڑی اور قسم قسم کے کیمروں کا رُخ اُس کی طرف ہو گیا۔ وزیر صاحب نے صرف مشین پر ہاتھ رکھا ہوا تھا جب کہ سارا بوجھ عظیم خاتون کے ہاتھوں پر آن پڑا ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹیس سی اُٹھی''(۴۰)

سارا وزن ریڑھ کی ہڈی پر پڑنے سے وہ ہسپتال پہنچ گئی وہاں کے اخراجات اُس کی دِن بھر کی مزدوری سے کئی گنا زیادہ تھے۔ پہلے مرحلے کے علاج پر ہی مشین بِک گئی اور اُسے مزید مشقت کرنے کی ہدایت جاری کی گئی۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ بقول شبنم رومانی:

> ''محمد الیاس نے اِس افسانے میں ایک چھوٹی سی کہانی کے ذریعے ایک بڑی سماجی کمزوری کی نشان دہی کی ہے''(۴۱)

افسانے میں مصنّف نے نچلے طبقے کی محرومی، بے بسی اُن کے اور حالات کو اپنے تخلیقی جوہر سے ایسے بیان کیا ہے کہ سیاستدانوں کے اور اہلِ اقتدار و با اثر افراد کے گھناؤنے چہرے، خبیث مسکراہٹ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جس کے پیچھے وہ اپنی چال بازیوں اور مکارانہ چالوں کو سامنے آنے نہیں دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ جس معاشرے میں اِس قماش کے لوگ پائے جاتے ہوں وہاں خوشیاں لا تعلق ہو جاتی ہیں۔ عمل ناپید ہو جاتا ہے اور انصاف اونگھ رہا ہوتا ہے زندگی بھر اہلِ دولت و اہلِ اقتدار تو مزے لوٹتے ہیں اور غریب کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔

افسانے ''ٹوڈا'' میں ایک غریب اور کم ذات انسان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں اور ہندوؤں سے الگ وطن بھی حاصل کر لیا مگر اُن کی رسوم، عادات و اطوار ہمارے اندر رچ بس گئے ہیں کہ اُن سے پیچھا چھڑانا نا ممکن دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان میں جب انگریز حکومت کرنے آئے تو وہیں سے جاگیر دارانہ نظام کی بنیاد پڑی سرمایہ داروں اور جاگیر داروں نے عام لوگوں کا جینا حرام کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی یہ جاگیر دار اور وڈیرے ہیں وہ خود کو حاکم اور ماتحتوں کو محکوم سمجھ کر اُن کی تذلیل کرتے ہیں۔ غریب کو دبانا، انھیں زندگی کی ہر خوشی سے محروم کرنا، ہر خوشی پر اپنا حق جتانا اور غریب کا حق مارنا ہی اِن کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس نظام میں غریب ایک ایک سانس اُن کے حکم سے لیتا ہے۔ ''دوسا'' بچپن سے ہی

اپنی والدہ کی شفقت و محبت سے محروم ہو گیا تھا۔ باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق لاڈ پیار سے پالا بلوچوں کے قافلے میں سے اونٹ کا ایک بچہ دوسے کو کھلونے کے طور پر ملا۔ ''ٹوڈا'' کی ماں مر گئی تھی اور خود زخمی تھا لہٰذا قافلے والوں نے ''دوسا'' کے کہنے پر ٹوڈا اُس کے حوالے کر دیا۔ ''دوسا'' کو ''ٹوڈا'' اپنے جیسا ہی لگا۔ دوسا نے اُس کی خوب خدمت کی اور پیار سے اِس کا نام ٹوڈا رکھا۔ دوسا اور ٹوڈا دونوں اکٹھے جوان ہوئے۔ دونوں کا یاروں کا ساتھ تھا۔

گاؤں میں میلہ لگا تو مویشیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں ''ٹوڈا'' ملکوں کے اونٹوں پر سبقت لے گیا۔ مہمان وزیر نے دوسا کو جیت کی خوشی میں گلے لگا لیا۔ نیز دو دسو روپیہ انعام بھی دیا۔ ملکوں کے لیے یہ بات ہضم کرنا بہت مشکل تھی کہ کمتر ذات کا شخص اتنی جرأت کرے۔ لہٰذا اُسی شام دوسے کے گھر ملک پہنچتا ہے اور کہتا ہے:

> ''میرا نام تمہیں معلوم ہے؟..... جی جناب! ملک دوست محمد ہے جی آپ کا نام..... ملک صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور پُھندنوں جیسی موٹی موٹی سیاہ مونچھیں، کلہاڑی کی طرح ترشی ہوئی قلموں کے اوپر سے گزر کر نفاست سے سنورے پٹوں کے کُنڈلوں سے جا ملیں..... اچھا چھوڑو نام کو، یہ بتاؤ اپنا اونٹ بیچو گے''(۴۲)

دوسے کے انکار پر ملک دوست کا پارہ چڑھ گیا۔ دوسا کا والد اُسے سمجھانے لگتا ہے تو دوسا بولا:

> ''ابا کمہار ہیں تو کیا ہوا؟ ہم اِنسان نہیں سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ باپ نے کہا۔ یہاں اللہ اور رسول کا فرمان کون مانتا ہے۔ اِس زمین پر ملکوں کا فرمان چلتا ہے..... دوسا بولا۔ تو پھر ابّا سیدھی طرح کہہ کہ ہم اِنسان نہیں''(۴۳)

ملک دوست ''ٹوڈے'' کو زبردستی کھول کر لے جاتا ہے اور بدلے میں دوسا اور اُس کے باپ کو مارا پیٹا جاتا ہے۔ ''ٹوڈا'' طبقاتی تفریق اور ذات پات پر مبنی افسانہ ہے۔ مصنّف نے بتایا ہے کہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مقدر میں ذلّت و غربت ہی ہے۔ اِس ذلّت کے کیچڑ سے اُن کا نکلنا بہت مشکل ہے۔ غریب ہمیشہ امیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ کیوں کہ اِس کے علاوہ اِس کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ازل سے ہی جاگیرداروں کی نسلوں کو بھی یہ باور کروایا گیا ہے کہ وہ من مانی کرنے میں آزاد ہیں۔ کیا کبھی ہمارے معاشرے

میں ایسا وقت بھی آئے گا کہ جس میں ظالم کا ہاتھ روکنے والا بھی کوئی ہو اور مظلوم کو یہ احساس ہونے لگے کہ ظلم کی اِس گھڑی میں وہ تنہا نہیں؟ یہ مختصر سا افسانہ بہت ہی سبق آموز ہے اور امیر غریب کے فرق کو واضح کرنے والا افسانہ ہے۔

''عورت کا استحصال''

اسلام کا جو معاشرتی نظام ہے اُس کی بنیاد انسانیت کے احترام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی گئی مخلوق میں انسان وہ واحد مخلوق ہے جسے برتری، مرتبہ اور عزت سے نوازا گیا ہے۔ اس مخلوق سے مراد صرف مرد نہیں بلکہ مرد و عورت دونوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اشرف المخلوق کے درجے پر رکھا ہے۔ اسلام سے پہلے دیگر مذاہب میں جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے عورت کو اُس کا جائز مقام کبھی نہ دیا گیا۔ مگر اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کو اُس کے حقوق سے نوازا۔ عورت ماں، بہن، بیٹی، بیوی غرض ہر حیثیت سے قابلِ لائق ہے اور انتہائی معزز و محترم ہونے کی وجہ سے مردوں سے کئی لحاظ سے آگے ہے۔ عورت کے عظیم ہونے کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ اِس کے قدموں تلے جنت ہے۔ اور پورے معاشرے کی تربیت اس کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ اولاد کی تربیت کے ساتھ ساتھ شوہر کی ہر خوشی کا خیال رکھنا اُسے اطمینان سکھ اور سکون مہیا کرنے کی ذمہ داری بھی ازل سے نبھاتی آئی ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا:

> ''اے لوگو! تمہارا عورتوں پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے اور میں تمہیں عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت کرتا ہوں''(۴۴)

اتنی احادیث اور آیات میں عورت کی فضیلت بیان ہوئی ہے اُس کے حقوق و فرائض کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود ہمارا معاشرہ کبھی عورت کو عورت سے آگے انسان تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے پیروکار ہونے کے باوجود اُس کی تعلیمات سے انحراف کر کے اُس کا استحصال کیا جاتا ہے۔

لہٰذا عورت کو اِنسان نہ سمجھتے ہوئے اُسے کٹھ پتلی کی طرح نچایا جاتا ہے۔ افسانہ ''عورت، گھوڑا اور مرد'' پڑھنے سے سب سے پہلے ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ آخر عورت، گھوڑا اور مرد افسانے کا نام کیوں رکھا گیا۔ اِن تینوں میں کیا مماثلت ہے؟ مگر افسانہ پڑھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عورت نام ہے وفا کا۔

اُسے چاہے ساری زندگی مرد کی طرف سے عزّت ملے نہ ملے مگر بدلے میں وہ ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ وفا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور مرد اپنی مردانگی کے زعم میں اِس قدر اکڑ جاتا ہے کہ اُسے جانور بنتے دیر نہیں لگتی۔ یعنی عورت گھوڑے کی طرح وفا کی علامت ہے اور مرد گھوڑے کی طرح اڑیل و مغرور۔

یہ افسانہ عورت کے استحصال پر مبنی افسانہ ہے۔ اُسے ہمیشہ کمزور سمجھ کر دھتکارا جاتا ہے۔ اُس کی عزّت نہ والدین کے گھر میں ہے اور نہ ہی سسرال میں حالانکہ عورت محبت، شفقت اور وفا کا پیکر ہوتی ہے اور مرد اُسے پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ یہ صنفِ نازک محض عورت ہونے کے جرم میں یہ سب کچھ برداشت کرتی آئی ہے۔ افسانے میں ہمارے معاشرے کے انتہائی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک پسماندہ اور کمزور عورت کی کہانی ملتی ہے۔ جو ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ شوہر بھلے اُس سے محبت نہ کرے۔ لیکن بچوں کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی تو دے۔ اُس کا خاوند ہمیشہ لڑائی کرتا اور گھر میں رکھے گھوڑے جیسا سلوک کرتا۔ زلیخا کے لیے گھاس پھوس سے بنا ایک کمرا ہی اُس کی کُل کائنات تھی۔ باہر کی دُنیا اُس نے دیکھی ہی کب تھی۔ پھمن زلیخا پر شک کرتا اور مارتا پیٹتا۔

> ”وہ زندہ تھی بھی نہیں۔ کب کی مر چکی تھی۔ شاہد بہت سی گالیاں ٹھڈے تھپڑ اور چھانٹے اس کے مقدر میں لکھے تھے..... اُس کی کوئی واضح خواہشات نہ تھیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتی تھی کہ بچوں کو پیٹ بھر کے کھانا مِل جائے..... پھمن چھانٹے سے نہ مارے۔ اُس کا چھانٹا بڑا ظلم تھا..... جس روز صبح یا دوپہر اِس کے بدن پر تین چار چھانٹے پر جاتے، سارا وقت جلن ہوتی رہتی“(۴۵)

مرد کی مردانگی کو سکون اُس وقت ملتا ہے جب وہ عورت پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اب جبکہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے مگر اِنسان کی اِس معاملے میں سوچ ابھی تک فرسودہ ہی ہے۔ بقول شکیل احمد:

> ”پرانے زمانے میں بیوی شوہر کی مار کھاتی تھی، ٹھوکریں سہتی تھی، بے عزتیاں گوارا کرتی تھی..... اب بے عزّتیاں سہنا سب سے بڑا عیب اور نسوانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے“(۴۶)

پھمن چونکہ کوچوان تھا لہٰذا ہر خوبصورت عورت سے فری ہونے کی کوشش کرتا۔ ایک پڑھی لکھی میم کے عشق میں گرفتار پھمن گھر جانا ہی بھول بیٹھا۔ گھر میں راشن نہ ہونے کی وجہ سے بچّے بھوک سے بلک اُٹھے تو زلیخا اپنی عزّت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھمن کے ماما کے پاس مدد کی غرض سے جا پہنچی۔ آخر ماما بھی تو ایک مرد ہی تھا جس کو عورت کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ اُس نے امداد کا وعدہ اِس شرط پر کیا کہ وہ اُس کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھاگ نکلے۔ زلیخا آخر کب تک وفا کا بُت بنی رہتی۔ اپنی غربت اور شوہر کے ناروا روّیے سے تنگ آکر اپنے شوہر سے بغاوت پر اُتر آتی ہے۔

> ''جب دن کو بھی پُھمن گھر نہ آیا۔ تو اُسے قطعاً پرواہ نہ رہی کہ راجپوتوں کی بہو بے پردہ ہونے جارہی ہے..... وہ سیدھی مامے کی دکان پر آگئی۔ ماما بچّے بھوکے ہیں۔ اری بھاگ چل میرے ساتھ ماماں اگر تیں میرے بچوں کو مارا یا پیٹ بھر کے کھانے کو نہ دیا تو یاد رکھ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا''(۴۷)

افسانے کی عورت کو برابری کا حق دینا تو دُور کی بات اُسے انسان بھی نہ سمجھا گیا۔ گھٹیا مخلوق سمجھتے ہوئے اُسے بارہا بے عزّت کیا گیا۔ ماما زلیخا پر پہلے بھی ڈورے ڈالتا رہا مگر اب جب وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوئی تو وہ بغاوت پر اُتر آئی وہ اِس بات سے باخبر تھی کہ یہ مرد اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا مگر اتنا یقین تھا کہ بچّے بھوکے نہ رہیں گے۔ افسانہ میں موجود کہانی بہت سارے سوال اُٹھاتی ہے اور جواب مانگتی ہے اُس معاشرے سے جو کہ اصل میں مردوں کا معاشرہ ہے۔

''وارے کی عورت'' بھی ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جس میں عورت کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ مصنّف کی نمایاں کہانیوں میں سے ایک نمایاں کہانی یہ بھی ہے۔ نام تو اِس عورت کا بھاگ بھری ہے۔ مگر اِس کا نصیب اِس کے نام کے بالکل برعکس ہے۔ بچپن سے ہی غربت اور افلاس میں زندگی گزارنے والی یہ بھاگ بھری کبھی اپنے بھاگوں کو نہ جگا سکی۔ ایک نظر انداز کی ہوئی عورت جس کی اپنی شخصیت وذات بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

گھر سے بے گھر ہوتی یہ بھاگ بھری ایک ایسے معاشرے کے اخلاقی زوال کی علامت ہے جہاں عورت کو بات بے بات طلاق دے کر اُس کے سر سے چادر چھین کر اُس کو ننگا کر دیا جاتا ہے۔ بھاگ بھری ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ گاؤں میں کالی جیبھ کی وجہ سے مشہور تھی کہ جو بات زبان سے نکالتی

ہے قبول ہو جاتی ہے۔ گھر والے غربت و تنگدستی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ بھاگ بھری جونہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے اِسے گاؤں کے ایک شخص سخی محمد کے ہاتھوں ایک گائے کے عوض بیچ دیا جاتا ہے مگر بھاگ بھری سخی محمد کو اولاد کی خوشی نہ دے سکنے کے جرم میں طلاق لے کر واپس ماں باپ کی دہلیز پر آ بیٹھی۔ سخی محمد جتنا پیسے والا تھا اتنا ہی کنجوس۔ بھاگ بھری وہاں بھی بھوک کو مٹانے کے لیے ترستی ہی رہی۔

> ''اُس نے گاؤں کے لوگ اکٹھے کر لیے اور دہائی دی کہ یہ عورت اسے لوٹ کر کھا گئی ہے۔ جب وہ شہر چلا جاتا ہے تو پراٹھے بنا کر کھاتی ہے اور دودھ پی کر پانی بھی ملا دیتی ہے۔ اب اُس کو اِس عورت سے اولاد کی آس بھی نہیں رہی۔ بن پھل پھُول بھی کوئی رُکھ (درخت) کسی کام کا ہوا ہے؟..... اس کے ماں باپ سے کہو اسے لے جائے اور میری گائے مجھے لوٹا دے''(۴۸)

کچھ عرصے بعد بھاگ بھری کی شادی ایک ستر سالہ بوڑھے چوہدری غلام محمد پٹواری سے کر دی جاتی ہے۔ جس کو کبھی دادا کہہ کر پکارتی تھی۔ یہاں اُس نے سچ مچ ایک چوہدرانی کی زندگی گزاری۔ بوڑھا غلام محمد بڑھاپے میں اِس کھلونے کو دل بہلانے کے لئے تو لے آیا تھا۔ مگر اُسے گوارا نہیں تھا کہ وہ ماں بنے۔ جب ڈاکٹر سے بھاگ بھری کو یہ خوشخبری ملی۔ چوہدری بولا:

> ''شام جب چوہدری گھر لوٹا تو حسب معمول اچکن اتار کر کھونٹی سے لٹکائی..... بھاگ بھری میں آج بہت پریشان ہوں۔ میرے پہلے ہی چھ بیٹے، پانچ بیٹیاں اور چھالیس پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہیں..... میں نے لیڈی ڈاکٹر سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ آج ہی اِس بلا سے جان چُھڑا لیں۔ اگر میری تجویز تجھے قبول نہیں تو مجھ سے طلاق لے لو۔''(۴۹)

بھاگ بھری چوہدری کو حمل گرانے سے انکار کر دیتی ہے اور اپنی ممتا کا خون ہونے سے بچا لیتی ہے۔ جس معاشرے میں انصاف کی کمی ہوتی ہے وہاں عورت زیادہ پستی ہے۔ اور خاص کر جہاں بھوک، افلاس و ننگ ہو اور دوسری طرف چوہدری اور دولت مند بدمعاش مگرمچھ کی طرف منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں۔ بقول نصیر احمد ناصر:

"محمد الیاس "وارے کی عورت "بڑا جاندار افسانہ ہے "وارے کی عورت "پڑھتے ہوئے عصمت چغتائی کا افسانہ "ننھی کی نانی "اور بشریٰ اعجاز کا افسانہ "رحمورام ریان والی "یاد آتے ہیں۔ ان تینوں میں "بھوک "مشترک موضوع ہے۔ اور تینوں کے مرکزی کردار اِس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں ساری قدریں دو وقت کی روٹی کے حصول کے لئے ننگے پن کا شکار ہو جاتی ہیں "۔(۵۰)

ایک غریب لڑکی مرد کو اولاد نہ دے کر اُس کے وارے میں نہ رہی اور دوسرے مرد کو اولاد دے کر وارے میں نہ رہی۔ افسانے میں سماجی اقدار کی پائمالی، خود غرضی، بے حسی اور استحصالی رویوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا۔

"پانی "ایک ایسا افسانہ ہے جس میں موضوع بہت عام اور سادہ ہے۔ مگر اِس موضوع کو اِس دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس کی گہرائی تک پہنچ کر عورتوں کی بہت ساری مشکلات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اور اُس مقصد تک پہنچتا ہے۔ جو مقصد اِس افسانے کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ دنیا اب اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے۔ ٹیکنالوجی سے بہت نئی ایجادات نے لوگوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ مگر گاؤں اور دیہات کی حالت ویسی کی ویسی ہے۔ انسان پانی کی ایک ایک بُوند کو ترستے ہیں اور یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اِنسان اور حیوان ایک ہی تالاب سے پانی پیتے ہیں۔ پانی ایک ایسی ضرورت ہے جو ہر انسان کی روح کو زندگی بخشتا ہے۔ لیکن گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ ساتھ مویشیوں کے لئے بھی عورت نے ہی پانی لانا ہوتا ہے پانی کا کنواں یا تالاب چاہے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو پانی کی ضرورت کو عورت نے ہی پورا کرنا ہے۔ عورت کی اِس سلسلے میں مدد کرنے میں مرد اپنی توہین سمجھتا ہے۔ وہی مرد جو عورت کو باہر نکلنے پر پابند کر دیتا ہے کہ بے ہودگی ہو گی۔ لیکن یہی عورتیں سروں پر مٹکے اُٹھائے ایک ڈھوک سے دوسرے ڈھوک تک جاتی ہیں تو اُس وقت اُن کی غیرت پر کیوں پردہ پڑ جاتا ہے۔ ویسے تو حیاء کے نام پر قتل ہو جاتے ہیں مگر وہی عورت جسم کی پاکیزگی کے لئے خود کو کسی تالاب پر برہنہ کرتی ہے۔ تو سب جائز سمجھا جاتا ہے۔ بقول مصنف:

"اِس بہنی کے مغربی کنارے پر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں عورتیں ایک دوسرے کے تعاون سے غسل کر لیا کرتی تھیں۔ عورتیں پانی بھرنے آتیں تو کئی کام یہاں نپٹا کر جاتیں "۔(۵۱)

افسانے میں ایک کردار "کہڑو" کا ہے۔ کہڑو کے گاوں میں پانی کی قلت تھی۔ جس وجہ سے وہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کوسوں دور "بہنی" سے پانی بھر کر لاتی اور گھر کے جملہ اُمور سر انجام دینے کیلئے پانی کا استعمال سر انجام نہایت احتیاط سے کرتی۔ مگر اُسی گھر میں اُس کا مرد سنگھڑ بیوی کے سر اور بغل کے مٹکے لے کر سب سے پہلے اپنے ہاتھ، منہ اور پاؤں دھوتا پھر خود گلاس بھر کر اپنی پیاس بجھاتا تب جا کر اُسے بیوی کی پیاس کا احساس ہوتا۔

احسان رانا "پانی" کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "پانی" ایسی کہانی ہے جو پانی میں رہتے ہوئے بھی پیاس و تلاش کو بڑھاتی ہوئی اختتام کو پہنچتی ہے۔ ان کٹھن منزلوں سے زندگی ہانپتی ہوئی گزرتی ہے۔ تو الیاس اپنی کہانی کو لہو سے تر کرتے ہوئے کرداروں کو عمر رواں دیتا ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لئے میلوں کا سفر طے کیا جاتا ہے۔ یہ فاصلہ بھی صنفِ نازک محض عورت ہونے کے جرم میں طے کرتی ہے عورت اسی تالاب کے کنارے غسل کرتی ہے اسی خوف سے بھی کہ نہانے کے لیے اُسے ادھر ہی آنا ہو گا"۔(۵۲)

کہڑو جب دریا پار گھروں میں لگے نلکوں کے بارے میں سنتی تو کہتی کہ یہ ضرور کوئی قیامت کی نشانیاں ہیں۔ جہاں عورت اتنے عیش و آرام سے رہ رہی ہے۔ اور اُسے پانی کے گھونٹ گھونٹ کے لئے محتاجی نہیں۔ ورنہ جو مشکل زندگی کہڑو کی تھی تو وہ اِن باتوں پر کیسے یقین کر لیتی۔ ایک دن پانی بھر کر لانے کے بعد وہ گھر پہنچنے ہی والی تھی کہ اُس کا پاؤں رپٹنے سے دونوں گھڑے زمین پر جا گرے۔ گھڑوں سے ضائع ہوتا پانی دیکھ کہڑو کو یوں لگا جیسے اُس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ وہ دردناک انداز میں رونے لگی، اور بولی:

> "خدایا! تو نے مجھے کوئی بڑا دکھ دینا ہی تھا تو سنگھڑ کو مار لیا ہوتا۔ میں بیوہ ہو جاتی، لیکن پانی سے بھرا بھرایا میرا گھڑا نہ توڑا ہوتا"(۵۳)

اگرچہ موضوع کے اعتبار سے یہ زیادہ وسعت نہیں رکھتا مگر اُس افسانے میں ایک تاثیر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ بقول شجاعت علی راہی:

"جناب محمد الیاس کا افسانہ "پانی" ایک منفرد معیاری اور کامیاب افسانہ ہے"(۵۴)

الغرض افسانہ "پانی" میں عورتوں کی ہی مشکلات، مسائل اور بے بسی کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔
بقول سیّد مسعود اعجاز بخاری:

"پانی" میں انہوں نے دیہات کی عورتوں کے مسائل و مشکلات کو جِس مشاہداتی وژن کے ساتھ پیش کیا ہے۔اِس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں"(۵۵)

iii. بے حِسی:

بے حسی سے مراد سرد مہر یا پتھر دل کے ہیں جس کے لئے انگریزی لفظ(Aathetic) استعمال ہوتا ہے لفظ بے حسی احساسات سے محروم ہونا ہے۔ سنگدل اِنسان اور مشین میں فرق کرنے والی چیز احساس ہے جب انسان کے اندر سے یہ احساس ختم ہو جائے تو بے حسی جنم لیتی ہے۔ قوموں کے زوال کی سب سے بڑی اور معاشرے کے بگاڑ کی وجہ یہ بے حسی ہے۔ رشتے، ناطے جذبات واحساس کی بنیاد پر ہوتے ہیں جب ایک انسان ان جذبات سے یکسر عاری ہو کر کوئی کام سر انجام دیتا ہے۔ تو اُس انسان کے اندر کرختگی، سختی آجاتی ہے۔ اُس کے جذبات برف کی طرح سرد پڑ جاتے ہیں لہٰذا جب وہ انتقام لینے پر آتا ہے تو کوئی بھی غلط کام کرنے پر اس کی روح نہیں کانپتی یہاں بے حسی کے تحت لکھے گئے افسانوں میں زیادہ تر ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی بے حسی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بے حسی والدین کی طرف ہو یا اولاد کی طرف سے۔ انسان کا سب سے قریبی رشتہ ماں باپ اور اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ والدین بچپن میں اُس کا سہارا بنتے ہیں، تاکہ اولاد بڑھاپے میں سہارا دے، مگر اُن میں سے کسی ایک کے دل میں بھی بے حسی کا بال آجائے تو وہ اِن رشتوں کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کی بے حسی دیکھنے کو ملتی ہے، جو وہ اپنی عوام کے لئے رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری جو انسان کو اپنی ذات کے مفاد و مسائل میں بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کے حصار میں قید ہو کر اپنی ذمّہ داریوں سے راہ فرار حاصل کر لیتا ہے۔ جو ایک انتہائی دردناک پہلو ہے۔

"انسان" ایک ایسا افسانہ ہے۔ جس میں مصنف نے ہمارے معاشرے کی ایک کھردری، زہریلی اور ہضم نہ ہونے والی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ لفظ "انسان" وہ جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں جس میں شکل و صورت اور ذات پات کی کوئی تفریق نہیں۔ مزید یہ کہ جس کو اللہ نے اپنی تمام مخلوق سے افضل ٹھہرایا۔ جسے

اللہ نے عقل و شعور جیسی دولت سے نوازا، نفع و نقصان میں فرق کرنا سکھایا۔ مگر انسان دو طبقات میں بٹا نظر آتا ہے۔ ایک طرف وہ انسان جسے اشرف المخلوق سمجھنا تو دُور کی بات اُسے جانور بھی نہ سمجھا گیا۔ اور دوسری طرف ظلم کرنے والا انسان جس میں عقل تو درکنار اس میں تو دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں۔ تو کیا یہ سماج جانوروں کا سماج ہے۔ جن میں ان کی صرف ظاہری شکل وصوت سر دھڑ تو انسان جیسے ہیں مگر انسانیت کے درجے پر فائز ہونا ان کا مقدر کہا۔

افسانے کی کہانی وِکٹر اور ایلس کی ہے، جو کہ پیشے کے لحاظ سے چوہڑے تھے۔ ایلس انتہائی خوبصورت عورت جبکہ وکٹر اچھے دل کا مالک تھا، دونوں جب شادی کے بندھن میں بندھے تو اس کی خواہش تھی کہ اسے بلدیہ کی ملازمت مل جائے، اور صرف سڑکوں کی ستھرائی صفائی والا کام کرلے تاکہ زندگی کے حُسن سے لطف اندوز ہو سکے۔ اُسے بھی اپنے انسان ہونے کا احساس ہو۔ یہ اُس دور کی بات ہے، جب گھروں میں فلش سسٹم موجود نہ تھا۔ کالونی کے رہائشی لوگوں کے اصرار پر بیت الخلاء کی صفائی والا کام ایلس کو مل گیا۔

> "کالونی کے مکینوں نے صبح صبح ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار ہونا ہوتا تھا، سب مرد چلے جاتے، وکٹر اور ایلس ناک منہ اچھی طرح ڈھانپ کر کام کا آغاز کرتے..... ہر لیٹرین کا ڈھکنا اُٹھانے سے پہلے ریڑھی کو کھڑکا کر اہلِ خانہ کو انتباہ کرتے تاکہ اگر کوئی شخص مصروفِ عمل ہے تو سنبھل جائے" (۵۶)

جب دونوں ماں باپ بنے تو دونوں کی خواہش تھی کہ کم از کم ان کے بچے غلاظتوں کے ڈھیر سے نجات پالیں اور ہماری اس کام سے جان چھوٹ جائے۔ ان کی اولاد بھی عام انسان کی طرح رہیں۔ صبح شام غلاظت سے بھری زندگی دیکھ دیکھ کر ایلس کو کھانے سے نفرت ہو گئی۔ یہ کام کر کر کے اسے اپنے انسان ہونے پر غصہ ہونے لگا۔ اُس کالونی میں سے ایک گھر سیٹھ عثمان کا تھا جو ایک ادھیڑ عمر شخص اکیلا رہتا تھا۔ ایلس اس کی نظروں کو باخوبی سمجھتی تھی۔ سیٹھ عثمان نے ایک دن کچھ پیسے اُس کی طرف بڑھائے اور اپنی نیت اُس پر واضح کر دی۔ ایلس نے شور مچا کر سب دوکانداروں کو اکٹھا کر لیا۔

ایلس کو اس سے پہلے اپنی زندگی غلاظت اور گند لگتی تھی مگر سیٹھ عثمان کی گندی سوچ نے اس کے نس نس میں بدبو بھر دی۔ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا ہے، ایلس پر چوری کا مقدمہ درج ہوا، پولیس ہر طریقہ استعمال کیا مگر انہوں نے جرم قبول نہ کیا۔ کوئی بھی صاحبِ اختیار غلاظت کے کپڑے سے شکست کھانے کو تیار نہ تھا۔

"رات کے پچھلے پہر میونسپل کمیٹی کے فیلتھ ڈپو پر اسے لے جا کر بے لباس کیا اور رسّے سے باندھ کر پوری آبادی کی غلاظت میں ڈلوا دیا....."(۵۷)

وکٹر کی ساری برادری کے ہڑتال کرنے پر وکٹر گھر آ گیا مگر سارے جسم پر کئی غلیظ پھوڑے اور پھنسیاں نکل چکی تھی، جو شاید کبھی نہ ٹھیک ہونے کے قابل تھیں۔ مختصر یہ کہ وکٹر کے اندر کا انسان اپنے ہی جیسے انسانوں سے شکست کھا کر رہ گیا۔ محمد حامد سراج لکھتے ہیں:

"محمد الیاس کا افسانہ "انسان" ذہن کے کینوس پر اَن مِٹ نقوش ثبت کرتا ہے۔ غلاظت میں لتھڑی ہوئی زندگی کو نوکِ قلم سے پاکیزہ لباس پہنانا آسان نہ تھا"(۵۸)

کسی بھی معاشرے کے اندر اخلاقی بے حسی اِس حد تک بڑھ جائے کہ اس کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نظر نہ آئے تو ایسے معاشروں پر اللہ تعالیٰ کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور ان کا بھی وہی حال ہوتا ہے جو باقی قوموں کا ہوا۔ بقول حضرت مولانا حکیم محمد صادق:

"جو ظلم کرنے والے حاکم ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے سوچیں کہ ان کی عاقبت کس قدر تاریک اور انجام کتنا بھیانک اور خوف ناک ہو گا"۔(۵۹)

افسانہ "پورا تول" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو بہت بھولی اور سادہ زمانے کے گرم، سرد حالات سے انجان پورا دن اپنے باپ کی آٹا تولنے والی مشین کے پاس کھڑی رہتی۔ انتہائی چھوٹی سی عمر میں ہی شادی کر کے یہ نو عمر اور سادہ لوح لڑکی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے انجان اگلے گھر جا پہنچی مگر لڑکپن اور شوخی سے بھری یہ لڑکی وہاں بھی سارا دن کھمبے پر پتھر برساتی اور کھیلنے اور معزوز ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ مگر آہستہ آہستہ زندگی کی حقیقت سمجھنے لگی۔

"انتہائی خوبصورت، دبلی پتلی، اور لمبی لڑکی جسے ابھی خود اپنے آپ کو سنبھالنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ زندگی کی خار زار راہوں پر ممتا کے بھاری پتھر اپنے نازک کندھوں پر اُٹھائے برہنہ چلی تو ساری حماقتیں شوخیاں اور لڑکپن کے کھیل بھول گئی"(۶۰)

آہستہ آہستہ گھر کا آنگن بچوں سے بھر گیا مگر ساتھ ہی فاقوں تک تو نوبت آ گئی۔ بڑا بیٹا اِس قابل ہو گیا تھا کہ ماں کے جذبات سمجھ سکے۔

"وہ اپنے بیٹے کو پڑھانا چاہتی تھی اور بیٹے کی ہستی بھی جب شعور کی پہلی کرن سے منور ہوئی تو تعلیم جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ ننّھے سے دل میں خواہش پالتا رہا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ اپنی ماں کے دکھوں کا مدوا کرے.....ماں کے دِل میں چھبے سارے کانٹے چُن لے، لیکن اُس کا وہی باپ جو کبھی خود چاہتا تھا کہ بڑا بیٹا تعلیم حاصل کرے، نہ جانے آغاز ہی میں کیوں ہانپنے لگا تھا"(٦١)

بڑے بیٹے کے بہت سے خواب تھے مگر بڑا بیٹا ہونے کے ناطے کم تنخواہ چھوٹی موٹی سی نوکری کر کے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھایا۔ شادیاں کیں۔ اور ماں کی طرح اپنی حسرتوں کو کسی الماری میں رکھے کپڑوں کی طرح دِل کے کونوں کھدروں میں ٹھونستا رہا۔ مسلسل محنت کی بدولت گھر سے غربت کی نحوست تو ختم ہو گئی۔ مگر ماں اب ریڑھ کی ہڈی کی مریضہ بن کر چارپائی پر جا لگی جس کی خدمت کے لئے ایک جوان لڑکی سرور جان رکھی گئی۔ اِس نے باقی کاموں سے فرصت پانے پر ایک تو شیزہ کو پسند کیا مگر اظہار کے لیے ہمیشہ موقعہ کی تلاش میں رہتا۔ اِظہار کا موقعہ آیا ہی تھا کہ لڑکی نے انکل کہہ کر پکارا۔ گویا وہ الفاظ نہ تھے ہتھوڑے تھے۔ خود ہی سے سوالوں جوابوں میں اُلجھتا گھر پہنچا کہ کیا عمر کے اتنے پَل بیت گئے کہ خبر بھی نہ ہوئی، گھر پہنچتے ہی مزید خبر ملی کہ سرور جان اُس کے باپ کے ساتھ بھاگ گئی۔

"وہ گھر پہنچا تو ماں نہ جانے کب سے رو رو کر بے سُدھ ہو چکی تھی۔ سیف خالی پڑا تھا اور پاس ہی ایک رقعہ:

تم یقیناً فرماں بردار بیٹے ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ یقیناً اپنی ماں کا خیال رکھو گے۔ میں اور سرور جان نکاح کر رہے ہیں۔ بس مجبوری سمجھ لو۔ ہمیں تلاش کرنے میں اپنا وقت ضائع مت کرنا"(٦٢)

افسانہ اخلاقی بے حسی پر لکھا گیا ہے۔ اِس میں دو قربانیاں دینے والے انسانوں کی کہانی ہے جن کی خوشیوں، آسائشوں، مسرتوں کے بارے میں کبھی کسی نے نہ سوچا۔ زندگی اور اِن کے خونی رشتوں نے ہمیشہ دھوکہ

دیا۔ماں کم عمری میں روایات کی بھینٹ چڑھی اور ساری جوانی قربانی دیتی آئی۔ بیٹا ساری زندگی بہن بھائیوں کے لیے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتا رہا۔ مگر وہ انسان جو خاوند تھا اور ایک باپ بھی۔ اُس کی اخلاقی بے حسی اتنے عروج پر کہ بیوی اور بیٹے کی خوشیوں کا قتل کر کے اُنہی کی چھینی ہوئی خوشیوں سے اپنی خواہشات کا مینار تعمیر کرتا رہا۔ اور ننگ محسوس نہ ہوئی۔

iv. منافقت:

جامع اللغات میں اس کا مفہوم ہے:

"نِفاق رکھنا"(۶۳)

جبکہ نسیم اللغات جدید اُردو میں اُس کا مفہوم ہے:

منافق: "دل کا کچھ، زبان کا کچھ، مکّار۔ ریاکار کافر ہونا"۔(۶۴)

جامع علمی اُردو لغت میں منافقت کا مفہوم انہی سے ملتا جُلتا ہے:

منافق: نفاق رکھنے والا۔ ریاکار۔ وہ شخص جس کے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، ظاہر میں دوست باطن میں دشمن۔ شریعتِ اسلامیہ میں وہ مسلمان جو بظاہر مسلمان مگر دِل سے کافر ہو۔"(۶۵)

اصطلاحی مفہوم:

"منافق-اسم فاعل نفاق کرنے والا مرد۔ دورخی کرنے والا۔یعنی زبان و عمل سے بظاہر مسلمان اور دل سے اسلام کے خلاف عقیدہ رکھنے والا"(۶۶)

لُغوی معنی:

یہ "نافقاء ونفقہ سے ہے۔ جس کے معانی ہیں گوہ (جنگلی چوہا) کا بھٹ۔ جس کے کم از کم دو منہ ہوتے ہیں ایک دہانے سے گوہ اِس میں داخل ہوتی ہے۔ شکاری اِس طرف متوجہ ہوتا ہے تو دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتی ہے۔ چونکہ اس کے بل کی ایک طرف کا نام نافقاء ہے تو اس سے منافق ماخوذ ہے"۔(۶۷)

منافق کے دو رُخ یا دو پہلو ہوتے ہیں اِس کے دل میں کفر ہے اور زبان پر دکھاوے کے لیے ایمان ہے۔وہ موقع کی مناسبت سے اپنے آپ کو اُسی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اگر کفر سے خطرہ ہو تو خود کو مسلمان کہے گا۔ اور اگر اسلام سے خطرہ تو خود کو کافر ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل اور زبان ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے رہے ہوتے۔ نفاق کی کئی قسمیں ہیں:

(i) نفاق عملی: (ii) نفاقِ اعتقادی:

(i) نفاقِ عملی: سے مُراد آدمی دائرہ اسلام میں تو داخل ہو مگر عملِ اسلام میں کمزور ہو۔

(ii) نفاقِ اعتقادی: سے مُراد ایسا آدمی جو کہ دل سے ہی قبول نہ کرے۔ لیکن دل میں کفر رکھے اور ظاہر میں اسلام۔ نفاق اعتقادی کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے۔

'' ان المنفقین فی الدرک الاسفل من النار ''(۶۸)

ان تمام تعریفوں سے ثابت ہوا ہے کہ منافق کی دو بڑی اقسام ہیں:

دائرہ اسلام میں ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خلاف اسلام کام کرنا مثلاً دھوکہ دہی، ملاوٹ وغیرہ جو سرے سے اسلام مانتے ہی نہیں، لیکن مسلمان ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔

اِن افسانوں میں ہمیں پہلی قسم کی منافقت نظر آتی ہے جو ہیں تو مسلمان مگر اُن کے کام اور عمل ایسے ہیں کہ انہیں مسلمان کہنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے اُخروی انجام سے بے خبر اپنے دنیاوی خواہشات میں اتنے مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں کہ انہیں دوسروں کو دھوکہ دینے میں ہی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی مکاّری اور ریاکاری، چالبازی سے یہ اپنا مقصد پورا کر کے دوسروں کی زندگیوں کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے ملاوٹ کی تو افراتفری اور لالچ کے اِس دور میں سب سے بڑی ملاوٹ انسانی خون میں ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ کبھی اپنے رشتوں میں ملاوٹ کرتے ہیں اور کبھی چیزوں میں۔ ان کے قول و فعل میں تضاد انسانی رشتوں، معاشرتی روابط، انسانی عقیدوں میں تضاد کا موجب بنتا دکھائی دیتا ہے۔

افسانہ ''فتویٰ'' میں مصنّف نے بڑی فن کارانہ مہارت سے اور مزاحیہ انداز سے اُن حضرات کی بات کی ہے جن کے قول فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ جو کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔ اُن پر یہ کہاوت بڑی اچھی لگتی ہے۔

اوروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت، اِن لوگوں کی ساری زندگی بظاہر استغفر اللہ کا ورد کرتے گزرتی ہے۔ مگر بغل میں منہ میں چھری رام رام کا ناٹک ان کے شب روز کا معمول ہے۔ جھوٹ نہ بولنا، دھوکا نہ دینا جیسے موضوعات پر بڑی لمبی لمبی تقریر جھاڑتے نظر آتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اس قسم کے تمام کاموں کے برعکس ہے۔

بقول ساجد خاقان:

> ''افسانہ نگاری کی یہ بے باکی مذہب و اخلاق کے بعض خود ساختہ ٹھیکے داروں کو تو کھلتی ہی ہو گی، کچھ مفتیانِ ادب کی طبع نازک پر بھی گراں گزرتی ہے''(۶۹)

ذات پات کے نظام نے ہماری نسلوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر انصاف کی عدالت لگا کر اُونچائی اور نیچائی کا معیار قائم کرتے ہیں اور پھر خود ہی فیصلے بھی سناتے ہیں۔ اس افسانے کا موضوع بھی ذات پات کا نظام ہی ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار کا نام نہیں بتایا گیا یتیم ہونے کے باعث قاضی صاحب کے گھر پرورش پائی۔ قاضی صاحب کی بیٹی اس کے ہم عمر ہونے کے باعث اس کا بہت خیال رکھتی۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھی۔

> ''جب بھی اپنی زبان سے مر جانے کے الفاظ ادا کرتا تو مدیحہ بڑے ہی غم ناک لہجے میں التجا کیا کرتی کہ ایسے نہ کہا کرے .....شاید وہ اسی لیے کھانے کی ہر لذیذ شے زیادہ مقدار میں اپنی پلیٹ میں ہی چھوڑ دیا کرتی''(۷۰)

جونہی جوانی کی طرف قدم بڑھایا تو قاضی صاحب نے اتنی مہربانی اور کر دی کہ اسے یتیم خانے بھیج دیا۔ وہاں جانے کے بعد اِس نے دن رات محنت کی اور معاشرے میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ اپنے دوست رانا ادریس سے ہمیشہ اپنے دل کی بات کرتا۔ مگر ذات کے کمّی اور یتیم ہونے کی وجہ سے کبھی وہ حوصلہ پیدا نہ ہو سکا، کہ جا کر قاضی صاحب کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکے۔ چناچہ ایک دن وہ رانا کو اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے، وہاں جا کر رانا نے بات اس طرح شروع کی۔

> ''قبلہ! گزارش یہ ہے کہ میں راجپوت ہوں۔ جب کہ وہ سیّد زادی..... لیکن ذات پات

کی تفریق آڑے آرہی ہے..... آپ سے راہنمائی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مولانا نے دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا شریعت تو قطعاً مانع نہیں۔ دین ذات پات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ کلمہ گو ہونا شرط ہے۔ بس یہ ایک روّیہ ہے۔ جو در حقیقت غلط طور پر ہم لوگوں میں راہ پا گیا ہے..... ہم دراصل منافقت کا شکار ہو چکے ہیں عقیدے کے اعتبار سے ایسے لوگ در حقیقت بھٹکے ہوئے بنیاد کو چھوڑ کر فروعات سے چمٹے رہتے ہیں"(۷۱)

رانا ادریس کے کہنے پر مولانا نے اس شریعی مسئلے پر تحریری طور پر فتویٰ تو دے دیا مگر جب رانا ادریس چند معتبر لوگوں کے ساتھ اپنے دوست کا رشتہ مانگنے جاتا ہے۔ تو مولانا کا پارہ چڑھ جاتا ہے، اور بولے:

"حیرت ہے، میرے ٹکڑوں پر پلنے والہ بچہ آج مجھے ہی سسر بنانے آگیا ہے"(۷۲)

رانا کے بتانے پر کہ انہوں نے ہی فتویٰ لکھ کر دیا تھا تو مولانا غصّے میں بپھر گئے اور کہا۔

"اچھّا تُم فتویٰ لینے آئے تھے ؟اس کاغذ کی بتی بنالو۔ میں اب سمجھا تمھاری سازش کسی گھمنڈ میں نہ رہنا۔ بڑا آیا سورج بنسی سُورما..... مجھے تم جانتے نہیں میں پہلے اعوان ہوں .....عالمِ دین بعد میں"(۷۳)

افسانے کا اختتام حیران کُن بالکل بھی نہیں کیوں کہ منافقت ہمارے معاشرے کی شناخت بن چکی ہے۔ ہاں نتیجہ اِس کے برعکس ہوتا تو تعجّب کی بات تھی۔

"قُفنس" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو دوسروں کو جِس فعل سے روکتے ہیں۔ اُسے خود کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ "قُفنس" کے حضرت صاحب بھی اِسی قماش کے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔

بقول علامّہ امیر شکیب ارسلان:

"قدیم دور میں مسلمانوں کی درستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ علماء پرہیز گار تھے۔ دنیا کے سازو سامان سے بے پرواتھے..... لیکن افسوس کہ اِن اچھے اور سچے عالموں کے بعد ایسے علماء پیدا ہوئے..... جو دُنیا کو شکار کرنے کے درپے ہو گئے..... عوام النّاس

اِن منافق مولویوں کی داڑیوں اور لمبے لمبے عصاؤں کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں"(۷۴)

افسانے میں منیر الدین بھی اِسی دھوکے کا شکار ہوا۔وُہ خود ایک تنگ نظر انسان تھا۔لہذا اُس نے عورت کے پردے پر کی گئی حضرت صاحب کی تقریر کو گویا اپنے ذہن کے گوشے میں چسپاں کر لیا تھا۔اپنے بیوی بچوں کو شہر محض اِس لیے لایا کہ دیہات میں عورت کے پردے کے حوالے سے کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔وہ حضرت صاحب کی اس بات کا شدّت سے قائل ہو چکا تھا۔

حضرت صاحب کے بقول:

"ایک پاک باز عورت پر واجب ہے کہ کسی بے پردہ عورت سے بھی پردہ کرے"(۷۵)

اُس نے بیوی کو زچگی کے دوران ہسپتال جانے سے اِس لیے روک دیا کہ وہاں مرد عملہ اور مرد ڈاکٹر ہر جگہ دندناتے پھر رہے ہوتے ہیں۔زچگی کے عمل سے گزرتے ہوئے اُس کی بیوی کی زندگی کی ڈوریں لمحہ بہ لمحہ کٹ رہی تھی،لیکن وہ اِس بات پر خوش تھا کہ مشکل صورتحال میں بھی اُس نے اپنے ایمان کو کمزور نہ ہونے دیا۔

"بیوی کی چیخیں دب گئی تھیں ،شاید اِس نے اپنے منہ میں کپڑا ٹھوس رکھا تھا۔
منیر الدین نے اپنے سوئے ہوئے بچوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔اس کا دل بھر آیا"(۷۶)

یہ ہمارے سماج میں پائے جانے والے لوگوں کی تنگدلی،بزدلی،کم عقلی اور جاہلیت کا نوحہ ہے۔اور اس جاہلیت اور کم عقلی کی بھینٹ چڑھ کر اپنا ہی نقصان کر ڈالتے ہیں۔اتنا نقصان ہونے کے باوجود منیر الدین کی خواہش تھی کی نمازِ جنازہ صرف حضرت صاحب ہی پڑھائیں۔

"حضرت صاحب ابھی تک اپنے دولت خانہ پر تشریف نہیں رکھتے تھے.....حضرت صاحب ہسپتال سے ایک منٹ بھی نہیں آسکتے تھے.....انہوں نے معذرت کر لی .....اللہ نے اُن کی بیٹی کو نئی زندگی دی.....سی زیرین بچے کی ولادت ہوئی ہے"(۷۷)

یہ حالت ہے ہمارے معاشرے کے عالم فاضل لوگوں کی۔ جو دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں۔

بقول محمد عطاالحق قاسمی:

> ''تقنس ہمارے منافقت زدہ معاشرے کی تصویر ہے۔ آنکھوں پر سیاہ عقیدے کی عینک اور قلب وذہن پر اندھی تقلید کی خزاں رت کا غلبہ ہو تو آنگن اُسی طرح اجڑ جایا کرتے ہیں۔ کبھی ہم نصیحت اور فصیحت کے فاصلے کو پاٹ دینے والوں کو بھی پہچان سکیں۔ تو شاید ایسے بے وجود ہو جائیں''(۷۸)

''گھوڑا'' منافقت میں لپٹے ایک ایسے فرد کی کہانی ہے۔ جو بچپن سے ہی غلط عادات کا شکار ہو گیا تھا۔ وہی لوگ جو اسے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے رہے۔ اب جوانی میں بھی وہی لوگ اِسے ترقی کرنے کا ہنر سکھاتے چلے گئے۔

یہ افسانہ ہمارے زوال پذیر تمدّن کی عکاسی کرتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے کے ذریعے ایک بار پھر زندگی کی اذیت ناک حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے بظاہر معاشرے میں کہنے کو تو ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ مگر اِس کا ماضی جس گدلاہٹ سے آلودہ تھا۔ اُسے بُھلا دینا اِتنا آسان نہ تھا خاص کر خود رفیع الدین کے لئے بھی:

> ''تن خُوب گورا چٹا اور ملائم سا تھا۔ سو مفت میں ملی اِس خدا کی دین کو اُس نے ہر کس وناکس پر بے دریغ وارا۔ کسی طلبگار کو کبھی مایوس نہ کیا..... وہ پیدائشی گھوڑا نہیں تھا نویں جماعت تک اُس کا پنڈا کورا رہا۔ لیکن پڑھائی میں بھی کورا ہی تھا۔ ایک ہمدرد خصلت اُستاد نے اُسے امتحان میں پاس کرانے کے لیے بغرض حوصلہ افزائی پیٹھ پر تھپکی دینے کا سلسلہ دراز کر دیا..... بعد ازاں اسی مہربان اُستاد کی وساطت سے رفیع الدین کا تعارف سرکاری ڈسپنسر جی ایم مرزا سے ہو گیا''(۷۹)

چنانچہ انہی عادات کی وجہ سے ''گھوڑا'' مشہور ہو گیا اور ڈاکٹر مرزا کے نام سے متعارف ہو کر امراض مخصوصہ میں فنّی مہارت حاصل کی اور کلینک کھول لیا۔ جب معاشرے میں اپنا ایک لولا لنگڑا سا مقام بنانے میں کامیاب

ہو جاتا ہے تو شادی کرنے کی سُوجھی، سونے پہ سُہاگا یہ کہ اللہ نے بیٹی بھی عطا کر دی۔ اب اِس کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ وُہ عملی سیاست میں جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اُس کی سوچ کے مطابق اب لوگ صرف ڈاکٹر رفیع الدین کے ماضی کو بھول کر حال کو جانتے ہیں، مگر انسان کے گناہوں سے بھرا ہوا ماضی کب اُسے چین لینے دیتا ہے۔ لہٰذا ماضی کی بازگشت اِسے ہمیشہ سُنائی دیتی اور وہ بیوی اور بیٹی پر شک کرتا۔ اور خود کو پاک باز ثابت کرتا۔

> "ڈاکٹر بڑا شکی مزاج ثابت ہُوا۔ دن میں کئی مرتبہ اچانک چھاپہ مارتا اور باتوں ہی باتوں ہی باتوں میں خود کو غیرت کے معاملے میں بڑا سخت گیر ظاہر کرتا..... ازدواجی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے معاملے میں یوں پوز کیا کرتا جیسے اِس مردِ خُدا کو ایسے سفلے فعل سے چنداں دلچسپی نہیں..... بیٹی کو اعلیٰ تعلیم اُس وقت تک جاری رکھنے دے گا جب تک وہ ماں بیٹی کے کردار سے مطمئن رہتا ہے" (۸۰)

انتخابی نتائج میں اِس کو صرف چار ووٹ پڑے۔ تین ووٹ اِس کے گھر کے اور چوتھا ووٹ.....؟ رفیع الدین کا ماتھا ٹھنکا۔

> "دوسرا اور تیسرا بالترتیب بیگم شاہدہ رفیع الدین نور آمنہ رفیع الدین۔ لیکن یہ چوتھا کس ماں کے کھسم نے ڈال دیا" (۸۱)

اپنے داغ دار ماضی کی وجہ سے بیوی، بیٹی پر شک کرتا لہٰذا جو مشغلہ خود اس کا رہا تھا۔ اب اِسے دوسروں کے لیے ناجائز لگنے لگا۔ افسانے میں ہمارے انحطاط پذیر اور منافقت زدہ معاشرے کے کئی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ جلد از جلد امیر بننے کے خواب میں ہم اپنی ذات اور انا کا بھی خون کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں منافقانہ روش بہت بڑھ گئی ہے۔ اس میں غریب سے لے کر امیر تک تمام کے تمام ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ لوگ بظاہر جس طرح کے ہوتے ہیں حقیقت اُس کے برعکس ہوتی ہے۔ اُن کے یہ نقاب زدہ چہرے دُنیا میں تو چھپ سکتے ہیں مگر اللہ کی ذات بڑی گرفت رکھنے والی ہے۔ اور ایک دن اللہ ان کی پکڑ ضرور کرے گا۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

> "بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے اور تم کسی کو اِن کا مددگار

نہ پاؤ گے "(۸۲)

مصنف نے یہاں چھپی برائیوں اور غلاظت کو بڑے جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام افسانوں میں اخلاقی زوال کی جو صورتیں سامنے آئیں۔ اِن میں ہمیں اُس دور سماج کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اِن تمام افسانوں میں مصنف نے سماجی حقائق کو ادب کا حِصّہ بنایا ہے۔

ب۔ "لوح ازل پر لکھی کہانیاں "اور مور پنکھ پر لکھی آنکھیں "میں اخلاقی زوال کی مختلف صورتوں کا جائزہ:

ہم محمد الیاس کے ان دونوں افسانوی مجموعوں میں موجود اخلاقی زوال کی صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں ہمیں اپنے ہی سماج کے اخلاقی و معاشرتی موضوعات کہانیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر فہیم اعظمی:

"آپ کے افسانوں کی ساخت آپ کے ماحول اور معاشرے کا پتہ دیتی ہے"۔(۸۳)

ایک ادیب کا کام ہی یہی ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے معاشرے میں موجود بگاڑ، کج روی اور خرابیوں کی نشاندہی کرے اور معاشرتی اصلاح کا فریضہ بخوبی سرانجام دے۔ محمد الیاس نے اپنے افسانوں کے ذریعے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا ہے۔

بقول حشرت رومانی:

"انہوں نے اپنے افسانوں میں انسان کی اخلاقی اسرار و رموز خصوصی طور پر خالص اِنسانی سطح پر بیان کیے ہیں۔ جن کی بنیاد انسانیت کی اعلیٰ اقدار ہیں۔ اُن کے یہاں جو ذہنی ادراک ہے، اُس کا تعلق معاشرتی شعور سے ہے "(۸۴)

اِن کے یہ موضوعات کوئی اچھوتے اور نئے موضوعات نہیں بلکہ یہ ہر معاشرے کے اندر پائی جانے والی خرابیاں ہیں۔ مگر مصنف نے اپنے وسیع وژن سے کام لیتے ہوئے ان موضوعات کو بخوبی برتا۔ ان کے یہ تمام

موضوعات عام زندگی سے قریب تر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان افسانوں کو اپنی زندگی کے قریب سمجھ کر دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ اِن کے کردار حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سچ اور حقیقت ہی نظر آتی ہے۔

بقول آئی۔ یو۔ جرال:

"محمد الیاس ہمیں ادب کی لذّت میں دردمندی کی لذّت بھی دیتا ہے اور سچ لکھنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے"۔(۸۵)

مصنّف نے ان افسانوی مجموعوں میں جن جن موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ دراصل یہی وہ برائیاں ہیں کہ جن کی لت پڑنے کے بعد وہ معاشرہ اخلاقی کج روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایسا معاشرہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ بقول محسن بھوپالی:

"یہ کہانیاں بہ حیثیت مجموعی ہمارے عہد کی تلخ حقیقتوں اور معاشرے کے تاریک گوشوں کا عکس بھی ہے اور عکاس بھی"(۸۶)

مصنف نے ان دونوں مجموعوں میں معاشرتی و سماجی حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ بدعنوانی، غریب کا استحصال، عورتوں کا استحصال اور بے حسی اور منافقت جیسی لعنتیں ہیں۔ بدعنوانی کے زمرے میں شامل جتنی کہانیاں ہیں وہ زیادہ تر غربت کی کوکھ سے جنم لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار غربت اور لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی جھوٹی شہرت اور دولت کی ہوس میں اپنے سگے رشتوں کو بھی مات دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ چاہے وہ فرشتے کا جاوید مرزا ہو یا التکاثر کا عجو کھڑ کنا۔ ان کہانیوں سے پتا چلتا ہے کہ چونکہ افلاس و غربت ایک انفرادی اور معاشرتی برائی ہے جو کہ معاشی مسئلہ بن کر رونما ہوتی ہے لہٰذا جلد از جلد غربت سے نکلنے اور امیر بننے کی فکر میں یہ لوگ ناجائز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ ان بدعنوان کرداروں کے ذریعے منصف نے بتایا ہے کہ دولت اور شہرت کی چکاچوند سے مرغوب ہو کر یہ لوگ اِنسانیت کے درجے سے بھی گر کر غیر اخلاقی کام سرانجام دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

جن کہانیوں میں غریب کے استحصال کی بات کی گئی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں صرف اور صرف سیاسی حکمرنوں، جاگیرداروں اور وڈیروں اور چوہدریوں کو جینے کا حق ہے۔ غریب طبقہ اپنی مرضی سے آیا، نہ ہی اپنی مرضی کی زندگی گزار سکا۔ وہ تو ہے ہی جی حضوری کے لئے۔ نیز ان کہانیوں کے

ذریعے ہمارے امراء اور وزراء کی من مانیوں کا ماجرا سنایا گیا ہے۔ اور غریب کی غربت میں لتھڑی زندگی اُسے کسی قسم کی مزاحمت یا سوال کرنے کا حق نہیں دیتی۔ نتیجے میں اس طبقے کا استحصال اعلیٰ ذات وخاندان کے ہاتھوں ہونا ان کا مقدر ہے ۔ انہی برائیوں میں شامل ایک اخلاقی برائی عورت کو اس کا جائز حق نہ دینا ہے۔ عورت ہمارے معاشرے کا سب سے کمزور طبقہ ہے۔ اسلام نے تو عورت کو اعلیٰ مقام پر فائز کیا ہے۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی:

> "حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سوا دُنیا کے کسی مذہب، کسی دستور اور کسی ضابطہ حیات نے عورت کی حقیقت اور اس کی اصلیت ومائیت کو بالکل نہیں سمجھا"(۸۷)

ہمارے معاشرے میں اسلام کی تعلیمات سے انحراف کرتے ہوئے اِس صنف نازک ارمانوں کو ہمیشہ کچلا گیا۔ چاہے "عورت گھوڑا اور مرد" میں پھمن کی بیوی ہو یا "وارے کی عورت" میں چوہدری کی بیوی یا پھر "پانی" کی کیڑو لیکن ایک خاص بات جو اس موضوع کے تحت لکھے جانے والے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ ہے عورت میں بغاوت کا جذبہ۔ اِن افسانوی مجموعوں میں عورت اپنے حق کے لئے بہت شدید قسم کی مذمت کرتی تو نظر نہیں آتی مگر بغاوت کا جذبہ اُس کے اندر موجود ضرور ہے۔ وہ چاہے معصوم وموہوم سا ہی کیوں نہ ہو۔ ۹۰ کی دہائی میں عورت کے اندر سر اُٹھانے کا جذبہ یا طاقت کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے۔ چونکہ اُس وقت کی سیاسی قیادت بھی ایک عورت کے ہاتھ رہ چکی تھی۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی عورت اپنے حقوق کے بارے میں تھوڑی بہت آگاہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔

بے حسی کے بارے میں بات کی جائے تو یوں تو اخلاقی زوال کی جتنی بھی صورتیں ہیں۔ وہ ساری کی ساری بے حسی کا ہی نتیجہ ہیں۔ مگر یہاں بطور خاص اِس موضوع کے تحت لکھے جانے والے افسانوں میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ خود غرضی اور انا میں انسان اس درجے گر جاتا ہے۔ کہ سانپ بن کر ڈستے اسے دیر نہیں لگتی۔ خاص کر افسانہ "انسان" میں ایک محنت کرنے والے بے ضَرر انسان کو انا کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ پورا تول ایک ماں اور بیٹے کی کہانی ہے۔ جو اپنوں کی بے حسی کا نشانہ بنے۔

انہی مجموعوں میں شامل کچھ افسانوں میں منافقت کے پہلو کو بھی چھڑا گیا ہے۔ افسانوں میں مفتیانِ اسلام، سیاسی کارکنان کے چہروں پر پڑے نقاب کی دبیز تہوں کی کئی پرتوں کو کھولا گیا ہے۔ "گھوڑا" کا ڈاکٹر رفیع الدین "فتویٰ" کا مولانا حضرت اور "قفس" کا حضرت صاحب کے ذریعے اِن چہروں کی اصلیت سامنے لائی گئی ہے۔ محمد ارشد نعیم کا کہنا ہے کہ:

> "محمد الیاس اُس گلی میں سے گزارنے اور بسنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جہاں سے ہم جیسے مہذّب اور دنیادار کترا کر آنکھیں چرا کر گزر جاتے ہیں..... وہ معاشرے کے تفادات کو بڑی بے رحمی سے موضوع بناتے ہیں اور جب رلاتے ہیں تو قاری بے ساختہ اشک بار ہو جاتا ہے" (۸۸)

اور یہ بات سچ ہے کہ منافقت کسی بھی معاشرے کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ بقول منصف:

> "ہم منافقت میں خود کفیل ثابت ہوئے۔ کہتے کچھ اور کرتے کچھ۔ منافق تو مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا، کیونکہ منافقت کسی بہادر قوم کا شیوہ نہیں" (۸۹)

غور کیا جائے تو یہ موضوعات صرف حاص ۹۰ کی دہائی سے جُڑے ہوئے نہیں بلکہ زوال کی یہ صورتیں تو ہر دور میں نظر آتی ہیں۔ اسی لیے محمد الیاس نے اپنے تمام افسانوں میں انہی موضوعات پر زیادہ لکھا۔ ان مجموعوں میں موجود ہر افسانہ کسی نہ کسی معاشرتی مسئلے کو بیان کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے قلم کے ذریعے اپنے قاری کا ہاتھ پکڑ کر چوک میں لے جاتے ہیں، جہاں پر صرف مسائل ہی مسائل ہیں۔ اور انسانیت سِسکتی نظر آتی ہے۔ دارا صل منصف نے بتایا کہ بظاہر سب ٹھیک ہے کا لبادہ اوڑھ کر کب تک ہم حقیقت سے نظریں چُراتے رہیں گے۔ اور کب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے۔ بقول سلطان جمیل نسیم:

> "ہر واقعہ قاری کے لیے انکشاف ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ غور و فکر کے دریچے بھی کھول دیتا ہے" (۹۰)

"لوح ازل پر لکھی کہانیاں" اور "مور پنکھ پر لکھی آنکھیں" میں موجود کہانیاں یہ حقیقت ہم پہ آشکار کرتی ہیں کہ اخلاقی بد اعمالیوں میں مبتلا کسی قوم کو عروج کا دورِ نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب تک خود اُن کے ضمیر

کی آواز اُن تک پہنچے۔ کسی قوم کے عروج وزوال کا اندازہ اُس کے اخلاقی معیار سے لگایا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ مصنف نے ان کہانیوں میں معاشرے کی بے چہرگیوں اور بدصورتیوں کو فنّی مہارت سے آشکار کیا ہے۔ یہی وہ ایسی بدصورتیں ہیں جو کہ معاشرتی فساد کا باعث بنتی ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

'' الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلٰدِ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ''(۹۱)

"ترجمہ: یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت زیادہ فساد پھیلایا تھا۔".

یہاں بتایا گیا ہے کہ آج کے اِس معاشرے میں افسران کی دنیا عیش وعشرت لہو ولعب ،ودولت کمانے جائیداد بڑھانے ،مادی حسن حاصل کرنے اور قوم کو اپنی مرضی کی بھینٹ چڑھانے تک محدود ہے۔ ہمارے معاشرے کا ہر فرد وُہ چاہے سیاسی کارکن ہو یا پولیس افسر ،شاعر ہو یا وکیل، استاد ہو یا مولوی مُلّا۔ ہر ایک کی دنیا بڑی عجیب وغریب ہے۔ ایک دوسرے سے تصادم آرائی ،بے عملی ، قوت ،برداشت کا فقدان اور انانیت سے عبارت ہے۔ اِن امراض نے ہمارے معاشرے کو نفسیاتی واعصابی لحاظ سے اِس قدر کمزور وشَل کر دیا ہے کہ شیخی بگھارنے ،مشورے دینے کا تو اِن کے پاس وقت ہے۔ مگر عملی طور پر خود اِن کے اندر کی دنیا ویران اور اندھیرے میں ڈوبی نظر آتی ہے ۔ اہلکار حاجت مندوں کی عزت اُتار کر رکھ دیتے ہیں۔ حکام ناؤونوش کی لذتوں میں ڈوبے پڑے ہیں۔ اور قومی ضروریات سے مطلقاً بے نیاز ہیں۔ طبقاتی تفریق وذات پات کی اُونچ نیچ نے انسانیت کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ظالم ظلم کرتا ہے۔ اور مظلوم ظلم سہنے کے لئے تیار ہے۔ سستی شہرت ، روپیہ پیسہ ، دھوکہ ، بدعنوانی ہی زندگی کا معیار ٹھہرے ہیں۔ شاذونادر ہی ایسے معاشرے غلاظتوں اور پستیوں سے بچ سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ یہ سب ہمارے معاشرے کی وہ حقیقتیں ہیں کہ جب تک ایک ادیب اپنے فن کے ذریعے انہیں نمایاں نہیں کرتا اُس وقت تک لوگوں کے اندر سوچنے ، غور وفکر کرنے اور اپنے آپ کو سدھارنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ادیب اپنی تصانیف کے ذریعے معاشرے کو آئینے میں اُن کا چہرہ دکھاتا ہے جس کی وجہ سے باضمیر لوگ ان کی آواز کے ساتھ آواز بلند کرتے ہیں۔ اور یہی ایک ادیب کی کامیابی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر (انٹرویو) از صائمہ میر، ۶، اپریل ۲۰۲۱ء بوقت ۱۱:۱۵

۲۔ ابو الکام آزاد، مولانا، اسلام اور جمہوریت، طیب و پبلشرز، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، س ن، ص:۹۹

۳۔ مجاہد حسین، بد عنوانی کی حکمرانی ایوب خان سے پرویز تک، الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص:۲۰۳

۴۔ نور سلطان نذر، اکیسوی صدی کی دہلیز پر، اسد پرنٹرز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص:۱۴۴

۵۔ حامد سعید اختر، بریگیڈیئر، ریاست، سیاست اور قیادت، پبلشرز، اے بہاولپور، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۶۴

۶۔ خالد علوی، اِنسان کامل ﷺ، الفیصل ناشران و تاجران کُتب آردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء ص:۵۷۴

۷۔ Dr. Shahid Siddique, The History of Educational Policies in Pakistan Article, Published, The News International, April 6, 2021.

۸۔ محمد حِفظُ الرحمٰن، مولانا، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، س ن، ص:۹۱

۹۔ مودودیؒ ابو الاعلی، سیّد، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکشنز پرائیویٹ لمٹیڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء ص:۲۹۹

۱۰۔ حکیم محمد صادق، مولانا، ریاض الاخلاق، علی آصف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۳

۱۱۔ وارث سرہندی، علمی اُردو لغت، علمی کُتب خانہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۷۶۴

۱۲۔ محمد رفیع، مولانا، جامع اللغات، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص:۴۵۵

۱۳۔ محمد امین، بھٹی، اظہر اللغات جامع اُردو، معراج پرنٹرز، اظہر پبلشرز، لاہور، س ن، ص:۴۴۹

۱۴۔ محمد عبد القادر عماوی، ڈاکٹر، ہندوستان کے سماجی مسائل، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۰ء، ص:۷۴

۱۵۔ لیاقت علی خان نیازی، ڈاکٹر، اسلام کا نظامِ حیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۷

۱۶۔ وارث سرہندی، عملی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۰۸

۱۷۔ محمد الیاس، فرشتے (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۲۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۴

۱۹۔ محسن بھوپالی، فرشتے، (تبصرہ) مطبوعہ، رابطہ، کراچی، جلد ۳، شمارہ ۷، اگست ۱۹۹۶ء، ص:۳۶

۲۰۔ لطیف کاشمیری، فرشتے (تبصرہ) ماہنامہ، ابلاغ، پشاور اپریل ۱۹۹۸ء، ص:۲۷

۲۱۔ محمد الیاس، ڈوگرا، مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۴۷

۲۲۔ ایضاً، ص:۴۵

۲۳۔ محمد فیروز شاہ، پروفیسر، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیوں کی جولانیاں (تبصرہ) مشمولہ، ابلاغ، ۱۹۹۷ء، ص:۸

۲۴۔ محمد الیاس، التکاثر (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۰۱

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۰۵

۲۶۔ محمد فیروز شاہ، پروفیسر، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیوں کی جولانیاں (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، پشاور، جلد ۳، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء، ص:۹

۲۷۔ وارث سرہندی، علمی اُردو لغت (جامع) علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۰۳

۲۸۔ ایضاً، ص:۱۳۲

۲۹۔ محمد الیاس، ایک بٹا چھ (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ یہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۳۰

۳۰۔ ایضاً، ص:۱۳۲

۳۱۔ مسعود اعجاز بخاری، سیّد، مشمولہ، ایک بٹا چھ، (تبصرہ) مطبوعہ، تجدید نو، لاہور، جلد ۲، شمارہ ۴، ۱۹۹۵ء، ص:۸۴

۳۲۔ عبد القادر عمادی، ڈاکٹر، ہندوستان کے سماجی مسائل، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص:۴۷

۳۳۔ حامد سعید اختر، بریگیڈیئر، ریاست، سیاست اور قیادت" پبلی کیشنز اے، بہاولپور روڈ، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۱۱۲

۳۴۔ محمد الیاس، اغوا، مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۶۲

۳۵۔ ایضاً، ص:۱۶۵

۳۶۔ محمد فیروز شاہ، پروفیسر، لوح ازل پہ لکھی کہانیوں کی جولانیاں (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، جلد ۱۴، شمارہ ۱، ۱۹۹۹ء، ص:۱۰

۳۷۔ شبنم رومانی، اغوا (تبصرہ) مطبوعہ، اقدار کراچی، جلد ۴، شمارہ ۱۱، ص:۴۷

۳۸۔ محمد الیاس، انا (افسانہ) مشمولہ، مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، نقشِ خیال میر پور، ۱۹۹۷ء، ص:۹۳

۳۹۔ ایضاً، ص:۹۴

۴۰۔ ایضاً، ص:۹۷

۴۱۔ شبنم رومانی، اغوا (تبصرہ) مطبوعہ اقدار، کراچی، جلد، ۴، شمارہ، ۳، ص:۴۸

۴۲۔ محمد الیاس، ٹوڈا، (افسانہ) مشمولہ، مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، نقشِ خیال، میر پور ۱۹۹۷ء، ص:۱۱۱

۴۳۔ ایضاً، ص:۱۱۹

۴۴۔ مودودیؒ، ابوالا علیٰ، سیّد، اسلامک ریاست، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۳۲۳

۴۵۔ محمد الیاس، عورت، گھوڑا اور مرد (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۶۶

۴۶۔ شکیل احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، ایاز احمد علی الماس، ڈومن پورہ، ۱۹۸۴ء، ص:۴۷

۴۷۔ محمد الیاس، عورت، گھوڑا اور مرد (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور ۱۹۹۵ء، ص:۴۷

۴۸۔ محمد الیاس، وارے کی عورت (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور ۱۹۹۵ء، ص:۱۴۰

۴۹۔ ایضاً، ص:۱۴۲

۵۰۔ نصیر احمد، ناصر، وارے کی عورت (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، پشاور، جلد ۱۱، شمارہ ۴، ۱۹۹۵ء، ص:۱۰۳

۵۱۔ محمد الیاس، پانی (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ص:۴۰

۵۲۔ احسان رانا، پانی (تبصرہ) مطبوعہ ابلاغ، پشاور، جلد ۷، شمارہ ۷، ۱۹۹۷ء، ص:۱۶

۵۳۔ محمد الیاس، پانی (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، ص:۴۲

۵۴۔ شجاعت علی راہی، پانی (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، پشاور، جلد ۴، شمارہ ۷، ۱۹۹۶ء، ص:۸۳

۵۵۔ مسعود اعجاز بخاری، سیّد، پانی (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، پشاور، جلد ۴، شمارہ ۷، ۱۹۹۶ء، ص:۶۷

۵۶۔ محمد الیاس، انسان، (افسانہ) مشمولہ، مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۷ء ص:۱۲۸

۵۷۔ ایضاً، ص:۱۳۵

۵۸۔ حامد سراج، انسان (تبصرہ) مطبوعہ، صریر، کراچی، جلد ۸، شمارہ ۷، ۱۹۹۷ء، ص:۸۸

۵۹۔ حکیم محمد صادق، مولانا، ریاض الاخلاق، علی آصف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۱۷۸

۶۰۔ محمد الیاس، پوراتول (افسانہ) مشمولہ، مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، نقشِ خیال، میر پور ۱۹۹۷ء، ص:۱۰۲

۶۱۔ ایضاً، ص:۱۰۴

۶۲۔ ایضاً، ص:۱۱۰

۶۳۔ محمد رفیع صاحب، مولانا، جامع اللّغات، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۱ء، ص:۲۶۶

۶۴۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سیّد، نسیم اللّغات جدید اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز کراچی، ۱۹۸۴ء، ص:۹۱۸

۶۵۔ وارث سرہندی، جامع علمی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۴۲۷

۶۶۔ ur.m.wikipedia.org

۶۷۔ ایضاً

۶۸۔ القرآن (سورۃ النساء) آیت:۱۴۵

۶۹۔ ساجد خاقان، اقلیم ادب کا نقش طراز محمد الیاس (تبصرہ) مطبوعہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، ص:۱۰

۷۰۔ محمد الیاس، فتویٰ (افسانہ) مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، نقشِ خیال، میر پور ۱۹۹۷ء، ص:۳۷

۷۱۔ ایضاً، ص:۳۷

۷۲۔ ایضاً، ص:۳۸

۷۳۔ ایضاً، ص:۳۸

۷۴۔ امیر شکیب ارسلان، علاّمہ، اسبابِ زوالِ امّت، کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی، س ن، ص:۶۹

۷۵۔ محمد الیاس، قُفنس، (افسانہ) مشمولہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۲۰۱

۷۶۔ ایضاً، ص:۲۰۱

۷۷۔ ایضاً، ص:۲۰۲

۷۸۔ عطاالحق قاسمی، قُفنس (تبصرہ) مطبوعہ، فنون، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۳

۷۹۔ محمد الیاس، گھوڑا، (افسانہ) مشمولہ، لوح ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء، ص:۲۷

۸۰۔ ایضاً، ص:۳۵

۸۱۔ ایضاً، ص:۳۸

۸۲۔ القرآن (سورۃ النساء) آیت:۴۵

۸۳۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ، صریر کراچی، جلد ۶، شمارہ ۵، ۱۹۹۰ء، ص:۱۲

۸۴۔ حشرت رومانی، چند ہم عصر افسانہ نگار، جاوداں پبلیکیشنز اتیچ رضویہ سوسائٹی ناظم آباد کراچی ۲۰۰۴ء، ص:۱۰۳

۸۵۔ جرال آئی، یو، میر پور، کا ادبی و سیاسی منظر نامہ (مضمون) مطبوعہ، روزنامہ، پاکستان، راولپنڈی، ۲، اگست ۱۹۹۹ء

۸۶۔ محسن بھوپالی، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیوں کی جولانیاں، (تبصرہ) مطبوعہ، ابلاغ، جلد ۷، شمارہ ۵، ۱۹۹۹ء، ص:۱۴

۸۷۔ احمد اکبر آبادی، سعید، اسلام میں عورت کا مقام، و مرتبہ "ذاکر باغ نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص:۲۶

۸۸۔ ارشد نعیم محمد، محمد الیاس ایک فطری افسانہ نگار، (تبصرہ) مطبوعہ گل کدہ، سہوان بدایوں، یوپی انڈیا، جلد ۸، شمارہ ۱۳، ۱۹۹۸ء

۸۹۔ محمد الیاس، آمریت کی چڑیل (مضمون) مطبوعہ، روزنامہ مساوات، ۱۹۹۰ء

۹۰۔ سلطان جمیل نسیم تبصرہ، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں (تبصرہ) مطبوعہ، سیپ، کراچی، شمارہ، ۶۶، جلد ۱۸، ص:۳۰۱

۹۱۔ القرآن، (سورۃ الفجر) آیت:۱۰، ۱۱

باب سوم:

دوزخ میں اک پہر اور منظر پس غبار میں سماجی حقیقت نگاری کی مختلف صورتیں

الف۔ اکیسویں صدی کا منظر نامہ اور سماجی حقیقت نگاری کے موضوعات

اکیسویں صدی کا منظر نامہ:

اکیسویں صدی کے اس منظر نامہ میں مصنف کے دو افسانوی مجموعے (جو کہ ۲۰۰۰ اور ۲۰۰۵ میں لکھے گئے) میں موجود اخلاقی زوال کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا۔ لیکن ان صورتوں کے تجزیہ سے پہلے اس عرصہ میں پائے جانے والے مختلف حالات کا جائزہ لیا جائے گا جو کہ اخلاقی بگاڑ کی وجہ بنے۔ نیز مصنف نے اپنے ان مجموعوں میں کون سی سماجی حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ۱۹۹۹ سے لے کر ۲۰۰۸ تک کا عرصہ مارشل لاء کا تھا ملک خواہ کوئی بھی ہو اس کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ وہاں جمہوریت قائم ہو۔ ملک کو نقصان پہنچانے میں مارشل لاء کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ مارشل لاء ظلم و استبداد کی علامت ہوتی ہے یہ نظام لوگوں میں مایوسی، عدم توجہی اور لاتعلقی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔

چونکہ مارشل لاء کے نظام میں شخصی آمریت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ حکمرانوں اور حکومت میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ملک کو نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مارشل لاء تو اُس وقت لگایا جاتا ہے جب ملک میں ضابطوں کے استحکام اور احترام کو خطرہ

لاحق ہو۔ لیکن یہ سب کچھ سطحی ہوتا ہے۔ مارشل لاء بذات خود ضابطوں اور قواعد کو پس پشت ڈال کر قوم کے لیے پریشانی، ہزیمت اور دکھوں کا سبب بنتا ہے۔

آج پاکستان میں جو عدم استحکام نظر آتا ہے اس کی بڑی وجہ پے در پے مارشل لاء کا نفاذ تھا۔ ایوب خان، یحییٰ خان، جنرل ضیاء الحق اور پھر پرویز مشرف عتاب کی صورت میں لوگوں پر نازل ہوئے۔ اس نظام میں چونکہ شخصیت پرستی کی بیماری غالب رہتی ہے۔ اپنی پسند و ناپسند کی خاطر عوامی امنگوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ذاتی مفاد کو ہی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ حکمران اپنے آپ کو ہی عقل کل تصور کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا جب اُن کی رخصتی کا وقت آتا ہے تو ہاتھ صاف کر کے نکل جاتے ہیں اور عوام کو تحفے کے طور پر بے شمار مسائل دے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں فوج نے نواز حکومت کے تمام راستے بند کر کے ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اقتدار پر قبضہ کر دیا۔ پرویز مشرف چیف ایگزیکٹو بن کر عوام کے سروں پر تو مسلط ہو گئے تھے مگر اس حکومت نے رہی سہی جمہوریت کو بھی کچل ڈالا۔ ملک کا ایک بار پھر معاشی و سیاسی استحکام ناپید ہو گیا اس دور میں غربت، مہنگائی، کرپشن جیسے مسائل نے عوام کا استقبال کیا۔ بقول مولانا محمد علی جانباز:

> ”جنرل پرویز مشرف تقریباً گزشتہ آٹھ برسوں سے چیف ایگزیکٹو اور صدر کے عہدہ پر متمکن اور عملاً سیاہ سفید کے مالک ہیں..... پاکستان کے عوام کی معاشی حالت کمزور ہوئی، قرضے بڑھ گئے ہیں، خطِ افلاس سے نیچے زندہ رہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔ ملک بھر میں بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافہ ہوا ہے۔ روپے کی قیمت میں اس قدر کمی ہو گئی ہے کہ عملاً پاکستانی روپیہ ٹیڈی پیسے سے بھی کم تر ہو گیا ہے“ (۱)

۲۰۰۵ کا زلزلہ ایک بہت بڑی آفت بن کر نمودار ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے گھر مسمار ہو گئے۔ اپنوں کے یوں چلے جانے کا دُکھ، مال مویشی، گھر بار سب تباہی کی نذر ہو گئے۔ بچ جانے والوں کے لیے نئے ٹھکانوں کی ضرورت تھی۔ ان تمام حالات نے لوگوں کا سکون چھین لیا اور لوگ ذہنی مریض بنتے چلے گئے۔ بنیادی ضروریات زندگی مہیا نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں حرص پیدا ہو گیا۔ نائن الیون کے واقعے نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ امریکہ جیسی سپر پاور نے پاکستان کی امداد بند کر دی۔ پراسرار گمشدگیوں نے لوگوں میں خوف، دہشت، اور بے چینی کی فضا پیدا کر دی۔ ملک میں ڈیم کی تعمیر شروع کی گئی نہ عوام کی بہتری کے لیے

کوئی مناسب پروگرام ترتیب دیا گیا۔ ناکام خارجہ پالیسی کی وجہ سے ملک بدنام ہو کر رہ گیا۔ ملک کے مذہبی اداروں میں خونی آپریشن کر کے نہ صرف مذہبی اداروں کی بے حرمتی ہوئی بلکہ عوام میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو زبردستی برطرف کرنا چاہا۔ جس سے ملک بھر میں شدید احتجاج شروع ہوا۔

ملک کے انتہائی مخلص اور محسن قوم کو نظر بند کر دیا گیا۔ جو کہ امریکا نواز پالیسی کا حصہ تھا۔ نصاب تعلیم سے اسلامیات کے مضامین اور قرآنی آیات کا خارج کر دینا انتہائی شرمناک واقعہ ثابت ہوا صدر کا یہ قدم ملک کو سیکولر بنانے کی ایک سازش تھی۔ حقوق نسواں ایکٹ میں ترمیم کر کے غیر اسلامی دفعات ڈال دی گئیں۔ سرکار کے پیدا کردہ مسائل عوام کے لیے وبال جان بن گئے۔ لہٰذا بے روزگاری، ناانصافی، رشوت، لاقانونیت، مہنگائی اور لوڈشیڈنگ نے عوام کو مایوس و پریشان کر دیا۔ نتیجتاً لوگ بے حس و بے بس ہو گئے۔ ان حالات میں ہر طرف عدل و انصاف کا خون ہو رہا تھا۔ غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ بظاہر میڈیا آزاد نظر آتا تھا مگر وہاں بھی یہ آزادی صرف اور صرف دکھاوے کے لیے ہی تھی۔

اس حکومت نے ملکی سیاسی و اقتصادی ڈھانچہ ترتیب دیتے وقت ناپسندیدہ افراد کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال باہر کیا۔ اور کہیں سرعام اور کہیں ڈھکے چھپے صرف ان افراد کو فوقیت دی گئی جو ان کے لیے فائدہ مند تھے۔ مارشل لاء کے دور میں ہی ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوئے کہ عدلیہ مجبور ہو گئی کہ وہ ہر فوجی انقلاب کو قانونی قرار دیں۔ ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے کہ عام آدمی کے منہ سے روٹی کا آخری نوالہ تک چھین لیا گیا۔ کرپشن کی وہ مثال قائم ہوئی کہ جس کی مثال ۶۰ سالہ تاریخ میں ملنا مشکل ہے رشوت کی بڑی مثال ڈیفنس کے علاقوں میں حکومت کے چہیتوں کو پلاٹس الاٹ کرنا ہے۔

بقول مجاہد حسین:

> ”جنرل پرویز مشرف نے متعدد بار اس امر کا اظہار کیا کہ آنے والے وقتوں میں بھی ان پر کوئی کرپشن، بدعنوانی اور بے ضابطگیوں کے الزامات لگانے کے جرأت نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ انہوں نے کوئی بدعنوانی اور بے ضابطگی نہیں کی۔ لیکن یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے“(۲)

کیوں کہ کے بہت سارے پلاٹس رشوت کے طور پر لیے اور دیئے جارہے تھے کچھ عرصہ پہلے جو لوگ بے سرو سامانی کے عالم میں تھے وہ حکومت کے نوازنے پر روز بروز کروڑ پتی ہوتے گئے اور غریب، غریب تر ہوتا چلا گیا۔ جس حکومت میں رشوت خوری ایک رواج بن جائے وہاں عوام کی بھلائی کی توقع کون کر سکتا ہے۔ قرآن مجید نے مال و دولت اور صاحب اقتدار کو بطور خاص قوم عاد و ثمود کے واقعہ سے ڈرایا۔ تاکہ انسانوں پر یہ چیز واضح ہو جائے کہ یہ تمام خزانے اور شہرت تو تم سے پہلے والوں کو بھی عطا ہوئے تھے۔ مگر تکبر کے نشے میں برباد ہوئے۔

بقول علامہ پیر سیّد نصیر الدین :

> ''مگر جب انہوں نے بے اعتدالیاں دکھائیں، خلق خدا پر ظلم و ستم کا دروازہ کھولا۔ از راہ تکبر زمین میں اپنی گردن بلند کی.....مال و اقتدار کو دائمی سمجھا.....زمین پر ہر طرح کا فساد پھیلانے لگے..... تیرے رب نے اُن پر عذاب کے کوڑے برسائے'' (۳)

غرض یہ کہ مارشل لاء نے ملک کی ترقی و خوشحالی کو بُری طرح متاثر کیا۔ پروفیسر خورشید احمد اپنی کتاب ''جمہوریت پارلیمنٹ اور اسلام'' میں لکھتے ہیں:

> '' فوجی حکومت نے انتظام کار سنبھال لیا۔ تقریباً ۲۴ سال مختلف شکلوں میں فوجی حکومت برسر اقتدار رہی۔ اور قوم کی توانائیاں ایک مارشل لاء کے بعد دوسرے مارشل لاء سے نجات پانے کی جدوجہد میں صرف ہوئیں''(۴)

پچھلے ادوار کی طرح اس دور میں بھی معیشت کی شرح نمو میں کمی، پبلک سیکٹر میں چلنے والے تمام بڑے اداروں کی زبوں حالی، بیروزگاری میں اضافہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی سے حالات اُس نہج تک جا پہنچے کہ جہاں قوم کے اندر زندگی کی کوئی جائز خواہش اور مثبت سوچ باقی نہ رہی۔ ملکی صورت حال سے قطع نظر اگر ہم اکیسویں صدی کی بات کریں تو یہ صدی ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ زندگی کی اس تیز رفتاری اور مصنوعی پن نے زندگی کو کھوکھلا کر کے اس کو بے معنی کر دیا ہے۔ آج کا انسان صرف اپنی ذات تک سمٹ کر رہ گیا ہے ایک روبوٹ بن کر جذبات سے یکسر عاری ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں خلوص، پیار محبت، ادب و احترام، سادگی، شرافت اور ایمانداری ہی لوگوں کی زندگی کا خاصہ تھے۔ گھر میں بسنے والے تمام افراد ایک دوسرے کی طاقت

سمجھے جاتے تھے۔ انسان رشتوں کی اہمیت جانتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔ انسانیت کا احترام لازم تھا۔ مگر ترقی کی اس دوڑ میں وہ سب جذبات و احساسات مشینی بن گئے۔ جدید مشینری نے جہاں لوگوں کی زندگی کو آسان بنایا ہے وہاں فوائد سے زیادہ نقصانات اُبھر آئے۔ مشینوں کی ایجاد سے لوگ کام زیادہ تر انہی سے لینے لگے۔ چنانچہ مزدور طبقہ کے لیے بے روزگاری مزید بڑھ گئی۔ انٹرنیٹ کے استعمال سے نوجوان نسل چھوٹی عمر سے ہی وہ چیزیں سمجھنے اور دیکھنے لگے جن کی اسلام میں ایک حد مقرر ہے۔ ہر وقت انہی چیزوں کے استعمال سے بچوں کی تربیت بُرح طرح متاثر ہو رہی ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد عبد القادر :

> ''سائنس، ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی کے تناور، سایہ دار درخت کے نیچے جس قسم کا تمدن پروان چڑھ رہا ہے۔ اس میں مادیت پسندی اور مفاد پرستی کے عناصر کی آمیزش ہے۔ ضروریات زندگی کی دوڑ میں انسان ایثار، قربانی، سچائی ہمدردی و بے غرضی جیسی عادات کو خیر آباد کہہ چکا ہے'' (۵)

آج کے دور میں ایک گھر میں رہنے والوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ انسان بھری دُنیا میں رہنے کے باوجود بے بس، اکیلا اور کم اہم ہے۔ وہ وقت چلا گیا جب گھر میں دوستانہ ماحول بنا کر خاندان والے ایک دوسرے کو وقت دیتے تھے۔ پڑوسیوں، رشتے داروں سے باہمی تعلق رکھا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کے میل جول سے دوستی بڑھتی تھی اور زندگی پُر لطف بنتی تھی۔ نئے دور میں یہ ساری خصوصیات و اخلاقیات ناپید ہو کر صرف اور صرف ایک گھر تک سمٹ گئی ہیں۔ انسان گھر کے اندر قید ہو کر گھٹن زدہ ماحول میں ذہنی مریض بنتا جا رہا ہے۔ نئی نسل میں اخلاقیات و تربیت کا سبق ماند پڑتا جا رہا ہے۔

بقول شمیم حنفی

> ''انسان سچ مچ خسارے میں ہے۔ چاروں طرف درد اور دہشت کا دور دورہ ہے۔ نیوکلیئر تجربے اور دھماکے ہمارے احساسات کو جگانے کی بجائے کُند کرتے جاتے ہیں''(۶)

انسان کے اندر سے قوتِ برداشت، صبر اور حوصلہ جیسی صفات ختم ہو رہی ہیں۔ بہتر معیارِ زندگی کے میسر نہ آنے کی وجہ سے غصّہ، نفرت، حسد، حرص، انتہا پسندی اور ان جیسی دیگر کئی معاشرتی برائیوں سے پلا

ہوا اژدھا نگلنے کے لیے تیار ہر وقت بیٹھا رہتا ہے۔ ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ معاشرے جلد تقسیم ہو کر زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں تہذیب کا زوال شروع ہوتا ہے وہاں غربت ڈیرے ڈال دیتی ہے، کلچر تہذیبیں اقدار و روایات نیلام ہو جاتی ہیں۔ وہاں چوہدری، وڈیرے، سائیں، نوبزادے جیسے القابات ہی اس معاشرے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ وہاں سیاستدان بانجھ تقریروں سے اپنے وعدے پورے کرنے کی بھونڈی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔

افراتفری کی اس دوڑ میں لوگ غلط کاموں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ صراط مستقیم کو چھوڑ کر مسائل کا چھٹکارا انہیں بے راہ روی میں نظر آتا ہے۔ بلاضرورت نمود و نمائش، دکھاوا، شہرت کی اس دوڑ میں انسان بے وقعت ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ پاکستانی معاشرہ تباہی و بربادی کی نذر ہو گیا اور ہمارا معاشرہ فراڈ، حق تلفی اور ناانصافی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اخلاقی اقدار کا جو زوال آج ہمارے سامنے ہے۔ یہ ماضی میں نہ تھا۔ چنانچہ یہی وہ کیفیت ہے جس کو اس دور کے افسانہ نگاروں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ان کے ہاں دُکھ، درد، غربت و افلاس، عیاری محرومی، خود غرضی، ذہنی انتشار، عصبیت اور آمریت کی سنگینی نظر آتی ہے۔
بقول شہزاد منظر :

> ”جدید افسانہ آج بھی ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے دور کا ترجمان اور عکاس ہے اس میں بھی سیاسی جبر، سیاسی ناانصافیوں، پامال عقائد، شکستہ اقدار اور فرسودہ نظام حیات کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے“ (۷)

گویا نااہل حکمرانوں، اڑیل آمروں کے جبر و استبداد، غریب کے استحصال اسمبلیوں کی برطرفی کی وجہ سے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح محمد الیاس کے ہاں بھی مخصوص حالات کے تحت بڑی بے چینی اور گھٹن نظر آتا ہے جس میں ہمارے نام نہاد، سیاستدانوں کے قول و فعل کا تضاد بھی نظر آتا ہے اور معاشرے کے تاریک پہلوؤں کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

بدعنوانی:

ہم دوسروں کی تقلید میں اُن پر اندھا دھند اعتماد کرنے لگتے ہیں اور اس اعتماد میں خود کو ہی نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ اکثر کارکنان حکمران اپنی سیاست کو چمکانے اور ذاتی پروٹوکول کے لیے اپنے پیچھے ایک پوری

فوج لگا دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ان کے لیے وفادار بنے رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ باقی عوام تو ایک طرف یہ ان وفاداروں کو بھی عزت دینا گوارا نہیں کرتے۔ افسانہ ''حیا'' میں بھی ایک ایسی ہی کہانی بیان ہوئی ہے۔ صوفی چبھا اپنے لیڈر پر جان چھڑکتا ہے۔ مگر خود اُس کے گھر میں غربت کی نحوست ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ بیت الخلاء کی صرف دو دیواریں کھڑی کر کے بوقت ضرورت چھت کے لیے چارپائی سے مدد لی جاتی۔ صوفی چبھا کی لیڈر کی زیر نگرانی ایک میگزین حیا کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ مگر غریب عوام کی عزت و حیا کی کس کو خبر تھی۔ گھر میں جوان بیٹی جب بغیر چھت والی لیٹرین میں گھستی تو باپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ آس پاس کی اونچی چھتوں والے گھروں سے لوگوں کی تانکہ جھانکی کا ہر وقت جھٹکا لگا رہتا۔ مصنف نے پل پل گزرنے والی غریب کی کہانی کو یہاں خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

> ''دوبئی والے پڑوسیوں کا لڑکا بھی بیشتر وقت اپنے گھر کی چھت پر سے بیت الخلا پر نگاہ رکھا کرتا۔ صوفی چبھا چونکہ بے حیائی کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا۔ اس لیے بیوی نے بیٹی کو سختی سے منع کر دیا کہ خبردار باپ سے ایسی کوئی بات نہ کرے..... بیٹی سمجھ دار تھی اس لیے حتی الوسع کوشش کرتی کہ رات کے اندھیرے میں ہی جملہ فطری مراحل سے گزر لیا جائے۔ اگر دن کو افتاد آن ہی پڑی تو بیت الخلا پر اُلٹی چارپائی کی چھت ڈال لی جاتی''(۸)

اپنے لیڈر کے لیے ایک فعال رکن بننے اور اُس کے لیے جگہ جگہ جلسے جلوسوں میں تقاریر کے باوجود صوفی چبھا کے گھر کا نقشہ کسی ماضی کے کھنڈر کی کہانی سنا رہا تھا۔ ایک ہی کمرے میں دو بوڑھے ماں باپ، بیوی اور ڈھیر سارے بچے ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ مگر لیڈر کی نظر التفات اپنے فعال کارکن پر کبھی نہ ہوئی۔ صوفی چبھا کی آنکھوں سے وفاداری کی پٹی اُس وقت ہٹی جب ایک کالم میں اُس کی لیڈر کی حقیقت بیان ہوئی۔

> ''ملک و قوم کو لوٹ کر حرام کی دولت کے انبار لگانے والے سب سے بڑے بے حیا ہیں۔ فحاشی اور بے حیائی کا قلع قمع کرنے کے لیے اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے چند بے حیاؤں کو گرفت میں لے لیا جائے۔ جنہوں نے کروڑوں عوام کے سر سے چھت، تن سے مناسب لباس اور منہ کا نوالہ چھین لیا ہے..... لیڈر کی زیر تکمیل محل نما

کوٹھی کا ذکر تھا۔ بچھتر ہزار روپے کی گولڈ کروم ٹونٹیاں نصب کی گئی ہیں'' (۹)

صوفی چبھا دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اپنے بیت الخلا اور لیڈر کے باتھ روم کا موازنہ کرتا رہا کہ پورے گھر اور بیت الخلا میں موجود چیزوں کی لاگت، لیڈر کے باتھ روم میں لگی ایک ٹونٹی سے بھی کہیں زیادہ کم تھی۔ افسانے کے آخر میں صوفی چبھا پر اپنے لیڈر کی حقیقت سامنے آئی تو اس نے ایک استقبالی ہجوم میں آکر اُسے خوب مارا اور دل کی بھڑاس نکالی۔ لیڈر نے جواباً کہا ''اوئے نمک حرام بے حیا! میرا قصور کیا ہے؟(۱۰)
پروفیسر محمد فیروز شاہ کا کہنا ہے:

> ''حیا'' انسانی تمدن کی ضیاء کا نام ہے فکر و نظر میں روشنی ہو تو معاشرے ایک بشارت بھری صبح بن جاتی ہے۔ لیکن جب رہنما کا عمل مستوجب سزا ٹھہرے تو لفظوں کے مفہوم منہ چھپانے لگتے ہیں'' (۱۱)

افسانہ ''حیا'' ہماری سیاست اور سیاستدانوں کے برہنہ بدن پر ایک تازیانہ ہے جس کی ٹیسیں اہلِ احساس دیر تک اُٹھتی محسوس کریں گے۔

''مجبور'' ایسا افسانہ ہے جس میں بے حس لوگوں کی عجیب قسم کی مجبوری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ پر بے حسی اور خود غرضی اور انا کی برف جم گئی ہے۔ خود تو ملک لوٹنے اور مار کھسوٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن جب اسی ملک پر آزمائش کا وقت آتا ہے تو خود کو لاچار، مجبور اور بے بس ظاہر کرتے ہیں۔ افسانے میں ایک ایسے فرد کی مجبوری بیان کی گئی ہے جو افسری کی ہر سیٹ کا مزہ چکھ چکا تھا۔ وزرات میں دو دفعہ رہا۔ بڑے بڑے سیاسی اور صاحب اقتدار لوگوں سے مراسم بنا رکھے تھے۔ اس خدمت کے بدلے ملنے والی دولت بیرون ملک محفوظ کر رکھی تھی۔ اور اکثر کہتا۔ ''تھرڈ ے معاشرے میں اصل مالی حیثیت ظاہر کرنا خطرے سے خالی نہیں'' (۱۲)
ساری اولاد نے مغرب میں تعلیم حاصل کی اور اُدھر ہی زندگی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بیرون ممالک سرمایہ کاری کے علاوہ یہاں پلازے بنوا رکھے تھے۔ بقول مصنف :

> ''دارالحکومت میں ایک پلازہ اور چار کنال رقبے پر ایک باغ تھا جس کے وسط میں شان دار گھر تعمیر کروایا۔ تاکہ عزیز و اقارب اور برادری والے بھی اس کی شان و شوکت کے

بارے میں کچھ جان پائیں۔ موسم گرما کے دو تین ماہ آرام سے گزارنے کے لیے سطح سمندر کے ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند ایک خوبصورت صحت افزا پہاڑی مقام پر بنگلہ تھا۔ سمندر کے کنارے ایک ہٹ اور لگژری اپارٹمنٹ خرید رکھا تھا" (۱۳)

جذبہ حب الوطنی اس قدر تھا کہ آبائی شہر میں قوم کی خدمت کی غرض سے ایک تعلیمی ادارہ بھی بنوا رکھا تھا جہاں پڑھنے والے زیادہ بچوں کی تعداد امیروں کی تھی۔ گویا بچوں کے بہتر مستقبل کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا مستقبل بھی محفوظ کیا۔ اتنا سب کچھ ہتھیانے کے باوجود ابھی بھی توقع تھی کہ موجودہ حکومت شاید انہیں پھر کوئی عہدہ عطا کرے۔ تاکہ وہ ملک و قوم کی پھر ایک نئے طریقے سے خدمت انجام دیں۔ ان کی مجبوری اُس وقت ظاہر ہوئی جب ملک میں بدترین خشک سالی کا قحط آیا۔ لوگ پانی کی ایک ایک بوند اور روٹی کے نوالے کو ترسنے لگے۔ مال مویشی، انسان غرض ہر چیز سسکتی نظر آنے لگی۔ انسانیت کی مدد کے بہانے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تقسیم کرتے ہوئے بے حس چہرے اخباروں کی زینت بننے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان صاحب کو بھی شوق ہوا کہ تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم بچوں کے والدین سے فنڈ کی اپیل کی جائے۔ یا انہیں کاش کوئی ریلیف فنڈ کا کمشنر ہی بنا دے تو وہ لوگوں کی مدد کرتے ہوئے میڈیا اور حکمرانوں کی نظر میں ہی آجائے۔ ذاتی جیب سے خرچ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر بات یہ دونوں میاں بیوی یہی کہتے کہ وہ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے وہ تو خود بہت مجبور ہیں۔ گویا خود کو مجبور کہہ کر بار بار غریب کی مجبوری کا مذاق اُڑایا جارہا ہو۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا۔

"کروڑوں کے سرمائے سے باغ، پلازہ اور سکول سے ہر ماہ پندرہ سولہ لاکھ سے زیادہ آمدنی نہیں ہو رہی اور مالیاتی اداروں میں بڑی رقوم پر منافع بھی سکڑ گیا ہے۔ ہمارے پاس اب دینے کو کیا رکھا ہے ہم کو خود بڑے مجبور ہیں" (۱۴)

افسانے میں بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بدعنوانی تو ہمارے لوگوں کی سرشت میں شامل ہو چکی ہے مگر اصل دکھ تو یہ ہے کہ ان کے اندر سے احساس زیاں بھی جاتا رہا۔

بقول پروفیسر محمد فیروز شاہ :

"مجبور" ملک لوٹنے والے خادمان قوم کا فسانہ ہے۔ دولت جس کا قومی ترانہ اور شہرت و

حکومت کی آرزو جن کے ہر عمل کا آشیانہ ہے۔ ایک کاٹ دار گہرے طنز کے نشتر سے محمد الیاس نے ہمارے معاشرے کے ناسور کا آپریشن کیا ہے جو قوم اور ملک کے وجود کو ذاتی نام و نمود کی آلائشوں سے بھرتا جارہا ہے"(۱۵)

افسانہ "ڈاکٹر لوگ" میں جس راز سے پردہ اُٹھایا گیا ہے وہ کسی سے بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ کرپشن جیسی لعنت صرف پولیس کے محکمے یا اعلیٰ سیاسی سطح تک ہی محدود نہیں بلکہ لوگوں کو جہاں موقع ملتا ہے وہ جھوٹی شان و شوکت اور اپنے آرام و آسائش کے لیے اس حد تک گر جاتے ہیں کہ انسان اور حیوان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوگ وہ فرشتہ سیرت انسان ہوتے ہیں کہ اللہ کے بعد لوگوں کو زندگی عطا کرنے والے یہ مہربان فرشتے دن رات ایک کر کے لوگوں کو صحت عطا کرتے ہیں۔ انہی فرشتہ صفت انسانوں میں کچھ حیوانی خصلت لوگ بھی دھاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ کب کس مریض کو چیر پھاڑ کر ان کی ہڈیاں تک چبا ڈالیں۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ ڈاکٹر لوگوں نے اب لوگوں کو صحت یاب کرنے کی بجائے اپنی نظریں صرف اور صرف پیسے پر لگائی ہیں اپنے فرض سے کوتاہ نظر اب پیسہ ہی ان کی زندگی کا حاصل مقصد بن چکا ہے۔

بقول مولانا حبیب الرحمان :

"اسلام کی تعلیم اعتدال اور میانہ روی کی ہے۔ نہ تو راہبوں کی طرح دنیا سے کنارہ کش ہونا چاہیے اور نہ ہی مال و دولت میں اس قدر انہماک ہونا چاہیے کہ زندگی کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے" (۱۶)

افسانے کا مرکزی کردار بشیراں بی بی پیشے کے لحاظ سے ایک دائی تھی مگر وہ ڈاکٹر کہلوانا زیادہ پسند کرتی۔ جس محلے میں بشیراں رہتی تھی اس کے محلے میں بشیراں کا گھر ہی شاندار تھا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ محلے کے بچے بشیراں کو ڈاکٹر کہتے تو وہ پھولے نہ سماتی۔ گھر میں چھوٹے موٹے آلات کے باعث محلے کے مریضوں کا اُدھر ہی چیک اپ کر لیتی۔ مگر ہسپتال میں ارد گرد کے لوگوں کو زیادہ ٹھاٹھ سے زندگی کا مزہ لوٹتے دیکھتی تو اس کے دل میں بھی زیادہ سے زیادہ کی امنگ جگہ لینے لگی۔

"ڈاکٹر نگینہ کے گھر گزاری ہوئی ایک رات بشیراں بی بی کی زندگی میں انقلاب کا پیش خیمہ

ثابت ہوئی۔ دس گیارہ سالہ لڑکے اور بارہ تیرہ سال کی لڑکی نے بشیر اں کو جادو کی ایک ایسی نگری کی بھرپور سیر کرائی جس کا کبھی اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ سحر زدہ سی تمام رات ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہی..... کھانے کی ایسی لذیذ نعمتیں اُس نے شاہد ہی پہلے ایک ساتھ کھائی ہوں، وہ سوچتی رہی کہ اگلے جہان نیکو کاروں کو جس طرح کی نعمتیں عطا ہوں گی، افسر لوگوں نے دنیا میں پہلے ہی فراہم کر لی ہیں" (۱۷)

بشیر اں کو اب اپنے گھر کی ہر چیز بُری لگتی۔ نیو ٹاؤن کی سلمٰی بیگم بھی جب گھر سے گاڑی نکالتی اور پیدل چلتی سلمٰی کو بیٹھنے کی آفر کرتی تو سلمٰی کے دل میں ننھی خواہشات پھر سے حرکت میں آ جاتیں۔ کفایت شعاری کا ہر حربہ آزمانے کے باوجود بشیر اں کی حالت ویسی کی ویسی ہی تھی۔ مگر نجی پریکٹس کرنے والے اور پرائیویٹ ہسپتال کے ڈاکٹروں کی اہلیت جان لینے کے بعد بشیر اں اپنے پیشے کی عظمت کے پیش نظر اسے ظلم قرار دیتی۔

"ڈاکٹر نگینہ کیا گل کھلاری تھی۔ کلینک میں محض بی پی چیک کروانے کے لیے آنے والی پروفیسر کی بیوی کے ساتھ حشر کر دیا بے چاری کو آٹھواں مہینہ تھا۔ نہ جانے کون سا انجکشن لگا دیا کہ دردیں شروع ہو گئیں اور ہنگامی طور پر بڑا آپریشن کر ڈالا۔ مردہ بچہ تھما کر مبارکبادی اور کہا کہ خدا کا شکر ادا کرے، جان بچ گئی... طبّی جذبات کے عوض سترہ ہزار کا بل وصول کر لیا" (۱۸)

بشیر اں کو سینئر ڈاکٹرز سے نفرت ہوتی چلی گئی۔ جب وہ شان دار ملبوسات اور گاڑیوں میں نظر آتے۔ بشیر اں نے سلمٰی بیگم سے بھی بہت دفعہ اس کے ٹھاٹھ کا راز جاننے کی کوشش کی۔ تو وہ کہتی کہ کبھی کبھار کچھ نہ کر کے بھی بہت کچھ ہاتھ آ سکتا ہے۔ بشیر اں پر سلمٰی بیگم کا راز بھی اُس وقت کھلا جب اُس نے بشر اں بی بی کے ایمان کی قیمت لگانے کی کوشش کی۔

"سلمٰی نے کہا اگر وہ بیس پچیس ہزار روپے حاصل کرنا چاہتی ہے تو اُسے ایک موقع مل سکتا ہے..... میں نے سوچا تمہارا فائدہ ہو جائے ورنہ کام کسی اور کے ذریعے ہو جائے گا اس میں پیسے اور ایک سرنج بھی ہے۔ وی آئی پی روم میں ایک عورت داخل ہوئی ہے

..... لیبر روم میں جانے سے پہلے اُسے ڈرپ لگی ہے..... موقع پا کر چند قطرے اُس سرنج سے ڈیکٹروز سے داخل کر دینا'' (۱۹)

بشیر اں نے اس کی بات ضرور سنی مگر اس کے ضمیر نے اُسے گمراہ ہونے سے بچالیا اور اُس نے تندرست و توانا بچہ ماں اور اس کے دادا کے حوالے کر دیا۔ اگر ہمارے معاشرے میں بشیر اں جیسے باضمیر لوگ ہر شعبے میں موجود ہوں تو اس زمین کو جنت بننے دیر نہیں لگے گی۔ ورنہ سلمٰی بیگم، ڈاکٹر نگینہ اور ان جیسے اور کئی لوگ اپنے سیاہ اعمالناموں کی وجہ سے اس دھرتی کے تن کو بھی سیاہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔

مصنف کے تمام افسانے کسی نہ کسی معاشرتی مسئلہ سے گتھے ہوئے ہیں۔ ان کا افسانہ ''ڈائری'' بھی ایک ایسے ہی سماجی و معاشرتی مسئلے کی نشاندہی کر رہا ہے کہ جو قاری کے باطن کو جھنجوڑتا ہے۔ یہ دنیا پوری کی پوری ایسے انسانوں سے بھری پڑی ہے جو منافقت کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر نیکی و خیر کے نعرے لگاتے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے اندر کا تعفن ایسی سڑاند پیدا کرتا ہے کہ جو آس پاس رہنے والے نچلے و غریب آدمی کو جھلسا دیتی ہے۔

افسانہ ''ڈائری'' میں ایک ایسے شہر کا نقشہ بیان کیا گیا ہے جس کی اونچی عمارتیں سیاسی حکمرانوں کے بلند بانگ دعوؤں کا بوجھ سہارنے کی کوشش میں لگی ہیں۔ مگر ان بدعنوان حکمرانوں کا جھوٹ ایسا ہے جن کا بوجھ یہ بلند عمارتیں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

''لاری سے اُترا تو برکت کے چہرے کی سیدھ میں دو منزلہ ہوٹل کی چھت پر حکومتی پارٹی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور جہازی سائز کے سائن بورڈ پر مقامی سطح کی ایک قد آور سیاسی شخصیت کی بہت بڑی تصویر الف کھڑی مسکرا رہی تھی..... تصویر کے قدموں سے لپٹا ہوا جلی حروف میں نعرہ درج تھا۔ ''اس دھرتی کو جنت بنائیں گئے ہم'' (۲۰)

جس دھرتی کو انہوں نے جنّت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس جنت کا نقشہ مصنف نے بخوبی کھینچا ہے۔ جہاں انسانی اور حیوانی پیشاب کی سڑاند سے لوگوں کا سانس بند ہو رہا تھا۔ جہاں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ جنت کہ جس کی اخباریں آئے دن ایسے قصوں سے بھری پڑی تھی کہ ماں اور بیوی بچوں کو بھوک کے ڈر سے قتل کر دیا گیا۔ ایک نوجوان نے غریبی اور بے روزگاری سے تنگ آکر ریل کی پٹڑی

پر خود کشی کر لی۔ جہاں چاندرات کو خاوند نے اپنے بیوی بچوں کو مار ڈالا۔ اور اسی جنت میں گاؤں سے برکت نامی لڑکا روز گار ڈھونڈنے آیا۔ برکت کا دوست فرڈی اڈے پر بنے بیت الخلا سے اچھا خاصا کما لیتا۔ لیکن اہلِ محلہ کے ممبر صاحب ان اڈوں پر چلنے والے بیت الخلاؤں سے حاصل ہونے والی رقم میں برابر کے شریک ہوتے۔ برکت کو حسد کی آگ نے ہوا دی اور اُس نے ممبر صاحب کے سامنے فرڈی کی اصل کمائی ظاہر کر دی۔

> " اڈے پر ایک کیبن نما بیت الخلا بنانے کے لیے اجازت حاصل کرنے کے سوال پر ممبر صاحب نے برکت سے کہا اوئے احمق انسان.....لوگ سارا دن کوئی یہی کام تو نہیں کرتے پھرتے۔ نقصان ہو گا۔ تو برکت نے موقع پر موجود طلب و رسد کی اصل صورت حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ فرڈی کی کمائی کے اعد دو شمار بتائے تو ممبر صاحب دنگ رہ گئے "(۲۱)

جب نئے بیت الخلا بنوائے گئے تو اُس میں نہ برکت کو روز گار ملا اور نہ ہی فرڈی کو۔ معلوم ہوا کہ ممبر نے کسی اور مضبوط پارٹی سے تگڑا مال وصول کر کے اُن سے معائدہ پکا کر لیا ہے یوں اس جنّت میں یہ دونوں غریب بھی ممبر صاحب کی بد عنوانی کی وجہ سے ہاتھ ملتے رہ گئے اور مایوس ہو کر گاؤں لوٹ گئے۔

> "افتتاح کے موقع پر دکانداروں نے ممبر صاحب کی خوب پذیرائی کی اور گلے میں ہار ڈالے۔ پریس والوں نے عظیم عوامی منصوبے اور ممبر صاحب کی تصویریں بنائیں..... ممبر صاحب بڑے فخر سے تقریر کرنے لگے۔ مجھے رفاہِ عامہ کے کام کر کے روحانی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھ سے آپ لوگوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم اپنے اس عظیم قائد کی قیادت میں ملک کی تقدیر بدل کر اس شہر کو پیرس بنانے کا عزم کیے ہوئے ہیں "(۲۲)

زمین پر غریب، غربا اور عوام الناس کو حشرات اور کیڑے مکوڑے سمجھ کر با اختیار لوگ ہمیشہ انہیں دھتکارتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی رسی بڑی مضبوط ہے اس کی پکڑ والے دن کوئی بچ نہ پائے گا۔ افسانہ "ڈائری" اُس شہر کو جنت بنانے والوں کی دھوکا دہی مکارانہ چالبازیوں کی کہانی ہے۔ وہ جنت جہاں ہر بندہ نظریں لگائے بیٹھا ہے کہ اُس بڑی عدالت کا دروازہ کب کھلے گا اور انہیں انصاف ملے گا۔

راضیہ شمشیر کا کہنا ہے:

''افسانہ ڈائری کردار اور سماج کے تضاد کی قابل نفرین صورت متشکل کرتا ہے۔ اورانفرادی واجتماعی منافقانہ رویوں کا بھی پردہ چاک کرتا ہے۔ محمد الیاس کا نمایاں ذہنی رجحان دوہرے رویّوں کی قلعی کھولنا ہے''(۲۳)

منافقت:

اپنے وطن اور اپنے وطن سے محبت انسان کی زندگی کو خوبصورت بھی بناتی ہے اور اُسے ذہنی سکون بھی عطا کرتی ہے۔ مگر ہم اپنے وطن سے دُور کسی دوسرے ملک میں کیسی ہی غلامانہ زندگی کیوں نہ گزار رہے ہوں۔ وہاں کی آسائشوں کی چکاچوند ہماری نظر کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ ہم اپنی روایات اقدار، ثقافت اور رسم ورواج تک کو فراموش کر دیتے ہیں افسانہ ''ایسی ویسی بات'' ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو کافی عرصہ لندن میں گزارنے کے بعد اپنے وطن پاکستان آتے ہیں تو اپنی دو جوان بیٹیاں بھی ہمراہ ہیں۔ کیونکہ ساری عمر باہر گزارنے کے باوجود وہاں کے لوگ پاکستان میں ہی بچوں کے رشتے جوڑتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی نفسیات بھی یہی ہے کہ کوئی بھی رشتہ پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو انہیں اپنے بچوں کا مستقبل باہر کی صورت میں اچھا نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ کالے خاں اور شریفاں اپنی بیٹیوں کو اسی غرض سے پاکستان لائے۔ شریفاں یہاں آکر دوسروں پر اپنے وطن سے نفرت کا اظہار کرتی اور کہتی۔

''آل ربش دھول، مٹی، مکھیاں، مچھر اور گندگی۔ ٹارابل اینڈ ہارابل، لوگ، موسم، اشیا اور ملک۔ بڑے فخر سے بتاتی کہ وہ برٹش نیشنل ہے۔ انسان کی قدر ہے، کُتّی اور کُتّے کے حقوق کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں لوگ جھوٹے، دغاباز اور ظالم ہیں..... وہاں کی ہر شے نیٹ کلین اینڈ ایس کی لینٹ'' (۲۴)

وہ ظاہر کرتے کہ وہاں یہ لوگ کتنی شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ بناوٹ کے اصولوں سے، یہاں آنے سے پہلے اُن کی ساس اور نندنے کوٹھی کو خوب صاف کروایا اور بہترین استقبال کیا۔ ان کے گھر والے اور برادری کے لوگ ان کو عزت دیتے نہ تھکتے اور رشک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے۔ لیکن منافقت کے خول میں چھپا سچ باہر آنے کے لیے اپنی جگہ کب بناتا ہے یہ کسی کو خبر نہیں

ہوتی۔ شریفاں اور کالے خان کی خوبصورت زندگی اُن کے انداز وروایات کی اصلیت اُس وقت سامنے آئی جب ان کی بیٹیوں کی تربیت اور ان کا ماحول لوگوں کے سامنے آیا۔

> ''بیٹیوں کے دماغ میں نہ جانے کیا فتور گھس گیا تھا کہ والدین اور اپنے آبائی وطن کی اقدر سے بغاوت کر کے انہیں حقیقی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ باپ بے چارہ اب کالے خان رہانہ چوہدری صرف نام کا ہی چوہدری رہ گیا تھا۔ وہ جب بھی کسی اصول، ضابطے، عقیدے اور غیرت کے تقاضے کا ذکر کرتا تو لڑکیاں'' شٹ'' کہہ کر اپنی راہ لیتیں۔ جلدی میں نہ ہوتیں تو To hell with کے الفاظ سے بحث سمیٹ دیتیں''(۲۵)

دیار غیر میں لوگوں کو کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ ''ایسی ویسی بات'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ ماں باپ تو یہ سب وہاں بھی برداشت کرتے رہے کیوں کہ پردیس میں کالے خان نے بھی مال بنانے کے لیے ہر طرح کی ہیرا پھیری کی تو بیٹیاں ماں باپ کے کالے کرتوتوں سے بھی باخبر تھیں۔ لہٰذا اب یہاں وہ چُپ ہونے والی نہ تھیں۔ لیکن گاؤں والوں کے سامنے جب ایک تماشا لگ گیا تھا گاؤں کے لڑکوں کو تو گویا دِل بہلانے کا ایک ٹھکانہ مِل گیا تھا۔ ماں باپ کے روکنے سے بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو ان کے رشتے طے کر دیئے گئے۔ مگر اس کو بھی انہوں نے Time Pass ہی سمجھا تمام قسم کی صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر کالے خان انتہائی مایوسی کے عالم میں تھا۔ لوگوں سے کہتا :

> ''اوئے پیارے بچو! جاؤ اپنے اپنے گھر، ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل انگلینڈ کی پیدائش ہیں۔ یو کے نیشنل، ماحول ذرافری ہے۔ خُدا کی قسم ایسی ویسی کوئی بات نہیں''(۲۶)

دراصل مصنف نے دیار غیر مقیم پاکستانیوں کے حرص ولالچ، ہیرا پھیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہاں کے آزادنہ ماحول میں جس طرح بچوں کی تربیت ہوتی ہے وہ ہماری اقدار وثقافت سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ پاکستانی لوگ کس طرح وہاں مشکل زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن یہاں آکر مجبوری کی وجہ سے منافقانہ روش

اختیار کرتے ہوئے خود کو خوشحال ثابت کر کے لوگوں کو مرغوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانے میں مصنف نے دو تہذیبوں کا تصادم، کرداروں کی منافقت اور اس کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے۔
بقول نسیم سحر:

''اَن پڑھ لنڈن پلٹ'' خاندانوں میں اکثر ایسے منظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ جسے محمد الیاس نے اس افسانے میں شریفاں کی دو بیٹیوں کی صورت میں تخلیق کیے ہیں مگر دیکھنے اور بیان کرنے میں بڑا فاصلہ ہے''(۲۷)

بقول خالد یوسف:

''کسی بھی تہذیب سے معاشی مفادات حاصل کر کے اس کے ضمنی اور مضر اثرات سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کیک کھا بھی لیا جائے اور بچا کر بھی رکھ لیا جائے'' (۲۸)

''گھر کی مرغی دال برابر'' پرانے بزرگوں نے اپنے تجربے اور مشاہدے سے جو بھی باتیں کیں ان میں کہیں بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے۔ افسانہ۔ ''درآمدی مہر'' پڑھ کر اس کہاوت کا ایک ایک لفظ سچ دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے میں ہمارے معاشرے کے افراد کی اُس نفسیاتی کیفیت کا بیان ملتا ہے۔ جس میں انہیں اپنی اور اپنے ملک کی ہر چیز ارزاں، بے وُقعت اور حقیر لگتی ہے مگر دوسروں کی گھٹیا چیزیں بھی ان کے لیے انمول ہیں۔ اسی نفسیاتی کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر سماج کے کچھ افراد ذاتی فائدے کی آڑ میں اپنے ہی لوگوں سے دو نمبری اور منافقت کرتے ہیں۔ افسانے کا کردار سیٹھ حاجی اعجاز بھی انہی لوگوں کی صف میں شامل ہے جو دوسروں کو احمق اور بیوقوف بنا کر اپنے آپ کو معاشی لحاظ سے مضبوط بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لوگوں کی نفسیات کا جائزہ لینے کے بعد اُس کا کہنا ہے:

''چوں کہ قوم کا مزاج شناس ہے لہٰذا اِس راز کو پا گیا ہے کہ یہاں جن کے پاس زیادہ مال ہے انہیں خالص سونا وطن عزیز کی مہر لگا کر پیش کرو تو وہ بغیر دیکھے پرکھے رد کر دیں گے۔ لیکن ردّی شے کو بہترین پیکنگ میں سجا کر غیر ملکی مہر لگا دو، یہ قدردان مہربان بڑے ذوق و شوق سے منہ مانگی قیمت پر گھر سے جا کر کہیں گے..... ہیلو ڈارلنگ! کم آن

یہ دیکھو میں کیا لایا ہوں" (۲۹)

سیٹھ اعجاز کے مطابق چونکہ اُس نے اپنے والد کی محنت، سادگی، شرافت اور غریبی دیکھی تھی لہٰذا اُس نے باپ کے مرنے کے بعد اُسی کاروبار کو دو نمبر طریقے سے ہر چیز پر دوسرے ملک کی مہر لگا کر آگے بڑھایا اور پیسہ کمایا۔ پہلے چونے کے کاروبار میں پیکٹوں پر میڈ اِن انڈیا، میڈ اِن جاپان کی مہر ثبت کی جاتی اور وہی چیز ہاتھوں ہاتھ بکتی۔ سیٹھ اسی طرح ترقی کرتے کرتے الیکٹرونکس کی صنعت کا سیٹھ بن گیا۔ دوسرا کردار ایک طوائف کا ہے۔ چونکہ اب اس دھندے میں غیر ملکی لڑکیاں بھی پاکستان آرہی تھیں اس لیے اس طوائف کو اپنا مستقبل اور دھندا خطرے میں پڑتا دکھائی دیا۔ سیٹھ کے ساتھ اس کے روابط تھے۔ لہٰذا اس نے اپنی داستان اس کو سنائی۔

> "دکھ اس بات کا ہے کہ ہم لوگ من حیثیت القوم منافقت کا شکار ہو رہے ہیں۔ جذبہ حب الوطنی پر باتیں پڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ لیکن عملاً کچھ نہیں کرتے۔ میری حکمت عملی بھی اس بے حسی کا تر نوالہ بن گئی اور خوشحالی کا دور دیکھنا نصیب نہ ہوا" (۳۰)

سیٹھ اُس کو بھی اپنے تجربے کی روشنی میں یہی قیمتی مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے۔

> "اوئے کم عقل عورت! اپنا سراپا آئینے میں غور سے دیکھ۔ رنگ وروپ اور ناک نقشہ کسی بدیسی منڈی سے درآمد شدہ آئٹم لگتا ہے..... کالج میں تم نہ فارسی بھی پڑھی ہے اور انگریزی کی ٹانگ بھی ہر وقت مروڑتی رہتی ہو..... بس اب مزید بے وقوف نہ بن بلکہ دوسروں کو بنا" (۳۱)

افسانہ معاشرے میں پائے جانے والے منافقانہ روّیوں پر طنز ہے اور زندگی کے سٹیج پر مصروفِ عمل کرداروں کے شخصی تضادات، انسانی روّیوں اور نفسیات کی آنکھ سے اوجھل رموز کو سامنے لایا ہے۔

بعض اِنسان صبح، شام نیکی اور بھلائی پر لیکچر دیتے تھکتے نہیں۔ مگر خود ان کے لیے یہی چیزیں حلال بھی ہیں اور پُرکشش بھی۔ منافقت کا یہ انداز معاشرہ کے لیے سب سے زیادہ بھیانک ہے جس میں انسان کے ظاہر و باطن، کھرے و کھوٹے کا پتہ نہ چلے۔ اور نہ جانے کتنے لوگ ان کی اس منافقت کے بھینٹ چڑھتے ہیں۔ افسانہ "ملمع" کے خواجہ صاحب بھی اسی قسم کی دوسری شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ راہ چلتے نوجوانوں کو سلام کی

اہمیت بتانا، ہر وقت نجاست سے دور رہنا، پاکیزگی پر لیکچر دینا ان کا معمول تھا۔ ہمیشہ کہتے کہ نیکیاں کمانے میں مومن کو حریص نہیں ہونا چاہیے اور لوگوں کی بے حسی پر ہر وقت کڑھتے رہتے۔ روز مرّہ کے معاملات میں ساتھ ساتھ اُونچی آواز میں با آواز بلند دعائیں پڑھتے۔ اپنے دوست احباب کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتے اور ڈانٹتے کہ اِس وقت کو غنیمت جان کر کچھ اچھے کام اپنے پلّے باندھ لو۔

> ''دانش کدہ پر شہر بھر کے شاعر ادیب بیٹھتے تھے۔ شعراء حضرات دن کے اوقات میں یہاں آنا شروع ہوتے تو رات گئے تک گھروں کو لوٹنا بھول جاتے۔ خواجہ صاحب کے نزدیک یہ سب لوگ راندۂ درگاہ تھے۔ خاص طور پر وہ ظفر نراس کے سخت خلاف تھے۔ بقول خواجہ صاحب ظفر نراس نے زندگی میں کبھی استنجا بھی نہ کیا ہو گا۔ وہ نجی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر مسئلے مسائل بیان کرتے تو اکثر و بیشتر غسل اور استنجے پر بڑی باریک بینی سے بحث کرتے ہوئے کہتے کہ جب تک کرڑ کرڑ کی آواز نہ آئے۔ طہارت کے جملہ تقاضے پورے نہیں ہوتے'' (۳۲)

مگر جب خود پر بات آتی ہے تو پھر آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ، صبح کی سیر کرتے ہوئے حاجت محسوس ہوئی تو ادھر ہی سکول کی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے اور پاکیزگی و طہارت حاصل کرنے کے لیے پتھر کے روڑے کی مدد لی۔ دوسروں کو سادگی کی تلقین کرنے والے کھانے میں ہمیشہ مٹن اور مرغن غذا ہوتی۔ ویڈیو، سینما گھروں اور عورتوں کی بے پردگی کے خلاف تھے۔ ان کے مطابق ان سب سے معاشرے میں اخلاقی بدحالی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قربانی کے گوشت کا دوست احباب نے شکوہ کیا کہ کم بھیجتے ہیں تو جواب ملا گوشت صرف حق داروں تک پہنچاتا ہوں۔

> ''سارے جانور ذبح ہو چکے اور کھالیں بھی اتر چکی تھیں ..... دل، کلیجے، گردے، کپورے، دستیاں اور رانیں اندر بھجوا چکے تو دورانیں اور دد دستیاں ایک ملازم کے حوالے کیں کہ آغا شہزادے کو دے آؤ خواہ مخواہ ریکارڈ لگائے گا..... قربانی کے اصل فلسفے کی روح کو پیش نظر رکھتے ہوئے خواجہ صاحب نے اوجریاں دھلوائیں، چربی اور اوجریوں کی بھی بوٹیاں بنا کر ڈھیر میں مکس کر دی گئیں۔ مولوی قائم دین کا خواجہ صاحب کو گوشت کے ڈھیر کو دیکھنا اچھا نہ لگا تو جل بھن کر کباب ہو گئے اور کہا ہائے

ہائے من پاپی کا پاپی رہا۔ آنکھوں کی بھوک نہ گئی"(۳۳)

تعلیم میں ناکامی ہوئی تو اپنی شہرت اور دولت کو وسعت دے کر زمانے بھر سے اپنی ناکامی کا بدلہ لیا۔ جگہ جگہ چھوٹے موٹے کاروبار کی فیکٹریاں لگا رکھی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ شعبوں پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ مگر مزدوروں اور غریبوں کے خلاف تھے کہ یہ غریب لچے لفنگے اور ہڈ حرام ہوتے ہیں اور اللہ ان کی نیتوں پر ان کو ان کی اوقات پر رکھتا ہے۔ مزدوروں کو طے شدہ اجرت پر ایک روپیہ زائد دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ بالائی سطح کے سیاسی لوگ خواجہ صاحب کے دوست احباب میں سے تھے جو ان سے ہر وقت کام نکالتے رہتے۔ مختصر یہ کہ ہمارے معاشرے میں لوگوں کا اس طرح کا دوہرے معیار زندگی اپنانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

لوگوں کی اصل زندگی پر جھوٹ، دھوکے، خواہشات کا ملمع ہے جو اصلیت ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ معاشرے میں پیروں، فقیروں پر لوگوں کا اس قدر اعتقاد جم گیا ہے کہ وہ جو بولیں وہی سچ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اللہ سے دعا کرنے اور مانگنے کی بجائے اپنی آدھی سے زیادہ دولت ان پیروں کے ڈیروں پر منتوں مرادوں میں لٹا دیتے ہیں۔ بدلے میں یہ پیر لوگ بھی صدیوں سے نسل در نسل لوگوں کو لوگوں کو لوٹتے آئے ہیں اور گدی نشین بن کر لوگوں کو اپنی غلامی کی طرف مائل کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ "کھوٹے سمّے" میں پیر صاحب کا کردار ایسا کردار ہے جو خود دم درود کر کے لوگوں سے پیسہ ہتھیاتے ہیں۔ مگر ان تعویزوں کا اثر نہ ہو تو الٹا لوگوں کی نیتوّں کو کوستے ہیں۔

> "لوگوں کا اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے۔ اسی لیے پریشانیاں مسائل اور بیماریاں بڑھ گئی ہیں۔ چپّے چپّے پر حکیم ڈاکٹر اور ہسپتال بن گئے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹا جا رہا ہے ..... یہ سب لوگوں کے اعمال اور کمزور اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جب ان کا یقین پختہ ہوا کرتا تھا۔ تعویز تو درکنار بڑے بڑے مرض ایک پھونک سے دفع ہو جایا کرتے تھے"(۳۴)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ اللہ کے اتنے پیارے ولی ہیں تو اللہ کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنا ان کا فرض اوّلین ہے۔ مگر جب یہ خود دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت ہیں تو پھر ان کے مریدوں کو شفا کیسے ملے۔

ایک دن جب کمال دین نامی شخص کھوٹا سکّا چپکے سے رکھ کر دم کروا کر چلا جاتا ہے۔ تو پیر صاحب آپے سے باہر ہو کر سارے ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بہت کچھ سناڈالتے ہیں۔

> ''ہاں! یہ اُسی کافر کی حرکت ہے۔ اِسی لیے اس پر خدا کی مار پڑتی ہے۔ کیا کیا عذاب ٹوٹتے ہیں مردود پر۔ عین جوانی میں بیوی مری۔ بکری مر گئی۔ اب معذور بیٹی گھر آن بیٹھی ہے۔ خود آدھے سر کے درد سے تڑپ رہا ہے۔ ایسا بدنیت شخص کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ پورے مہینے سے دم کروا رہا ہے اور آج چپکے سے کھوٹا روپیہ رکھ کر چل دیا''(۳۵)

یہ دُنیا دارالمقافات ہے۔ آج جو کرو گے وہی کل بُھگتنا پڑے گا۔ افسانے میں ایک طرف تو پیر صاحب کی منافقانہ طبعیت کو نمایاں کیا گیا ہے تو دوسری طرف کمال دین کی خصلت جو کھوٹا سِکّا۔ چھوڑ جاتا ہے جب پیر صاحب کا بیٹا اپنی اوباش طبعیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کمال دین کی معذور بیٹی کے پاس اپنے جذبات کی تسکین کے لیے جاتا ہے۔ تو بدلے میں وہی کھوٹا سکّا تھما کر واپس آ جاتا ہے جب کمال دین پیر صاحب سے شکایت کرنے آیا تو ثبوت کے طور پر وہی کھوٹا سکّا پیش کیا۔ پیر صاحب نے کمال دین کو منہ بند رکھنے کے لیے رشوت کے طور پر کچھ کرنسی نوٹ ہاتھ میں تھمائے اور بولے۔

> ''کمال دین! میرا مان رکھ اور ہمارا لنگ پردہ۔ تم لوگوں پر ہمارے نسلوں کے احسان ہیں۔ سوچو ذرا، ورنہ آج تم لوگ کافر ہوتے.....بس تم اپنی زبان بند رکھنا''(۳۶)

مختصر یہ کہ مصنّف نے اِس افسانے کے ذریعے یہ سبق دہرایا ہے کہ جس معاشرے میں قول و فعل میں تضاد پایا جائے وہاں عمل و اثر بے سود ہو جاتے ہیں۔ وہاں دعائیں، اعتقاد سب غارت جاتا ہے۔ نتیجتاً وہاں بے عملی، نحوست، افراتفری، بے چینی جنم لیتی ہے۔

ظلم و ستم :

ظلم و ستم کی لُغوی تعریف:

''ظلم و ستم، بے انصافی کرنا'' (۳۷) قرآن پاک میں اس کے لیے دو اور لفظ ''بغی'' اور

''عدوان'' استعمال ہوئے ہیں۔

نسیم اللّغات میں ظالم کا مفہوم ہے:

ظالم: ''ظلم کرنے والا، ستانے والا'' (۳۸)

محمد صادق حکیم کا کہنا ہے:

'' ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا اس سے تجاوز کرنا حد محدود ہے، واقع ہونا ساتھ زیادتی یا نقصان کے، بے جا بے وقعت، بے موقع، بے محل کسی امر کا پیش آنا''(۳۹)

معاشرے میں یہ جو تمام بگاڑ و انتشار اور بربادی و تباہی کی وجوہات ہیں ان میں سے ایک وجہ ظلم ہے اور ظلم اس معاشرے میں داخل ہوتا ہے جہاں سے عدل ختم کر کے ظلم کرنے کے لیے راہ ہموار کی جاتی ہے۔ ظلم کرنا اصل میں فخر و تکبّر کی علامت ہے کہ انسان اللہ کی زمین پر رہتے ہوئے اس کے احکامات اور اُس کے ڈر سے بے نیاز ہو کر انسانیت کے ساتھ جو چاہے روّیہ و برتاؤ روا رکھے۔ معاشرے میں جب عدل و انصاف کا بول بالا ہو گا تو ہی اِن کو نجات مل سکتی ہے۔ ایسے لوگ چونکہ صرف ظاہراً انسان کے روپ میں ہوتے ہیں۔ مگر دراصل انسان نہیں ہوتے جن سے کوئی انسانی ہمدردی کی جائے۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

''در حقیقت انسانیت کے جسم کا ایسا عضو ہوتے ہیں۔ جس سے زہریلا اور فاسد مادہ بھر گیا ہو۔ اور جس کے باقی رکھنے سے تمام جسم کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس لیے عقل و مصلحت اندیشی کا یہی تقاضا ہے کہ اس فاسد عضو کو کاٹ دیا جائے''(۴۰)

جب کوئی معاشرہ عدل سے اپنا ہاتھ کھینچ کر من مانی کو ترجیح دیتا ہے تو وہاں حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ وہاں بے ہودگیاں اور خود غرضیاں جنم لیتی ہیں۔ ایسا معاشرہ بغاوت اور سرکشی پر اُتر آتا ہے اور وہاں کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ بد اخلاقیوں کو ہی اخلاق سمجھ لیتے ہیں۔

جس معاشرے میں ظلم و جبر کا رواج ہو جاتا ہے وہاں کے لوگوں سے انصاف کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے اور عوام الناس یہ باور کر لیتے ہیں کہ نجات کے تمام راستے مسدود ہو گئے اور یہی ظلم سہنا ان کا مقدر ہے۔ ظلم سہنا اس معاشرے کا رواج بن جاتا ہے۔

مصنّف نے منافقت زدہ، چہروں اور ظلم و ستم کی کہانی اپنے افسانے ''امیر شہر کا ڈنکا'' میں بیان کی ہے۔ ''امیر شہر کا ڈنکا'' اُس وقت بجتا جب امیر شہر کوئی بہت بڑا کام سر انجام دیتے۔ بعض لوگ جھوٹی اور نام نہاد شہرت کے اس قدر دیوانے اور بھوکے ہیں کہ اس بھوک کو مٹانے کے لیے وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ امیر شہر نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جس روز اس نے عدل و انصاف کا کوئی بے مثال کارنامہ سر انجام دیا تو ڈنکا اس کے نام سے بجا دیا جائے۔ امیر شہر چھوٹے چھوٹے معمولی نوعیت کے ظلم میں تو ہر وقت مظلوموں کی داد رسی کرتے رہتے۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ڈنکا صرف اُس صورت میں بجے کہ جب کوئی بڑا کام سر انجام دیا جائے اور اُس کا نام سنہری باب میں لکھا جائے۔

کچی بستی میں بسنے والے غریب ہمیشہ اس بات کے منتظر رہتے کہ یہاں کوئی ظلم ہی ہو جائے تا کہ امیر شہر کی نظر کرم ان پر بھی پڑ جائے۔ اسی بستی میں بسنے والا کاتب وہ فردِ واحد تھا جس کو ایوان میں شناخت حاصل تھی۔ کاتب کا ہمسایہ کسان امیر شہر کی نظر میں آنے کے لیے کئی پیشے بدلتا ہوا آخر کار پیشکار کے طور پر ایوان میں پہچانا جانے لگا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مگر کچھ عرصہ سے شہر میں کہیں کوئی ظلم روانہ ہوا تو سب کو فکر لاحق ہو گئی کہ ڈنکا پڑا پڑا کہیں بوسیدہ نہ ہو جائے اور امیر شہر کسی روحانی عارضے میں مبتلا نہ ہو جائے۔

> ''فوری طور پر اعلیٰ سطح خفیہ اجلاس بلایا گیا اور متفقہ فیصلے کے بعد تشویش ناک صورت حال کو بدلنے کے لیے ایک انتہائی زیرک اہل کار کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ پوری رازداری سے قلیل ترین وقت میں بڑی ہنر مندی سے کوئی جواز تلاش کرے کہ جلد سے جلد امیر شہر کے نام سے ڈنکا بجایا جا سکے'' (۴۱)

اُسی رات کچی بستی کی ایک لڑکی سے زیادتی ہوئی اور اُس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ صبح سارا ملبہ کاتب پر ڈال دیا گیا اور گواہی کے طور پر پیش کار کو پکّا کر لیا گیا۔ مگر عین موقع پر سب کے سامنے کاتب نے ایک ایسے راز سے پردہ اُٹھایا کہ سب حیران رہ گئے۔

"کاتب کو ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزا سنانے کا وقت آیا تو اُس نے ایک ایسے راز سے پردہ اُٹھا دیا۔ جس سے کار پردازن دم بخود ہو کر رہ گئے۔ طبیب نے معائنہ کرنے کے بعد تصدیق کر دی کہ وہ واقعی پیدائشی طور پر مخنّث ہے" (۴۲)

لہٰذا اب پیشکار گواہی نہ دے سکا۔ حقائق کیا تھے یہ صرف پیشکار ہی جانتا تھا۔

"پیش کار کے نئے بیان کو درست تسلیم کر لیا جاتا تو عدل و انصاف کی عظیم الشان عمارت زمین بوس ہو جاتی اور انصاف بہر صورت ہونا تھا" (۴۳)

دوسرے روز پیش کار کو مقامِ عبرت پر سنگسار کیا گیا اور ہر طرف امیر شہر کا ڈنکا بجتا رہا۔ افسانے میں بتایا گیا کہ ظلم کی داستان رقم کر کے پھر انصاف کا بول بالا کرنے والوں کی اِس دُنیا میں کمی نہیں۔ ظالم کے ہاتھوں ہی انصاف بھی ہوا۔ مصنّف نے امیر شہر کے کردار کو ظلم و ستم کی بدترین مثال بنا کر پیش کیا ہے۔

جس معاشرے کے انسان حیوانوں کی خصلت رکھتے ہوں وہاں برائی عام ہو جاتی ہے اور بھلائی کرنے والے لوگ تعداد میں بہت کم رہ جاتے ہیں۔ نتیجتاً بڑے لوگ معاشرے کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں ظلم و ستم نا انصافی کا بازار ہر جگہ گرم ہے۔ مگر پولیس کا ڈیپارٹمنٹ جو کہ غلاظت، گندگی، رشوت، حرام خوری، ظلم اور ناانصافی کی مثالیں ہر دور کی تاریخ میں رقم کرتا آیا ہے۔ محمد الیاس کا افسانہ "دوزخ میں اک پہر" ایسا افسانہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پولیس کی کارستانیاں اور بداخلاقیاں جب عروج پر ہوں تو وہاں کے معاشرے کو دوزخ بنتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دوزخ کہ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا تو بے قصوروں کو ملتی ہی ہے مگر توبہ کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

جس ادارے کو محافظ بن کر لوگوں کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہیے وہی ادارہ لوگوں کی عزتوں پر دھاک لگائے بیٹھا رہتا ہے تو پھر اللہ کے سوا کسی انسان سے خیر کی امید کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار گوہر ایک سکول ٹیچر تھا۔ سکول کے علاوہ ایک ٹیکسی کرائے پر دے رکھی تھی۔ جسے بوقت ضرورت وہ خود بھی ذاتی استعمال میں لاتا۔ راستے میں جاتے جاتے دو پولیس کانسٹیبل سے اس بات پر بحث ہو گئی کہ (S.H.O) کے بچوں کو سکول سے لانے کا حکم سنایا گیا جبکہ وہی وقت گوہر کی بیٹی کی چھٹی کا تھا۔ انکار کو پولیس والوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا اور گوہر کو (S.H.O) کے پاس لے گئے۔ ماسٹر گوہر چونکہ خود ایک پڑھا لکھا

شہری، باادب، نفیس گفتگو کرنے والا شخص تھا۔ اس لیے تھانیدار کا نقشہ بھی اس کے ذہن میں کچھ اسی قسم کا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے پر اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گوہر کے یہ بتانے کے باوجود کہ وہ ایک پڑھا لکھا شہری ہے۔ S.H.O نے کہا۔

"تمہارا گریڈ ابھی ..... کے راستے نکل جائے گا تمہارے باپ کا کنجر راج ہے ..... چلو کان پکڑ لو۔ جس طرح سکول میں لڑکوں کو مرغا بنایا جاتا ہے" (۴۴)

گوہر پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش برسادی اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔ گوہر کے دل میں طرح طرح کے خدشات جنم لینے لگے۔ اُس کا جی چاہا کہ اس دوزخ میں خودکشی کر لے تو اس طرح کی تذلیل سے بچ جائے۔ کسی وقت تو گوہر کو یوں لگتا کہ یہ اپنا وطن نہیں بلکہ کسی دشمن ملک میں گرفتار ہو گیا ہے۔ تھانیدار گوہر سمیت ہر قیدی کو اتنی غلیظ گالیاں نکالتا کہ گوہر کا ذہن منجمند ہو جاتا۔ اسی دوران ایک دوسرے پولیس سپاہی نے گوہر کو دبے الفاظ میں رشوت کا مطالبہ کر دیا کہ جان چھڑانے کا واحد راستہ یہی ہے۔

"گوہر نے مردہ سی آواز میں دریافت کیا کہ کتنی رقم سے کام چلے گا تو وہ قدرے توقف سے بولا ایک بات وہ دماغ میں بٹھائے کہ یہ درندہ بوٹیوں پر منہ نہیں مارتا، سموچا نگلتا ہے گائے بکرا یا ہرن نہ سہی، بھلے خرگوش ہی ہو" (۴۵)

گوہر یہ سوچتا کہ یہاں ایک ایک تھانے میں کتنے کتنے مطلق العنان بادشاہ ہیں جو ہر لمحے انسانیت کی تذلیل کر کے اس کی روح کو تار تار کرتے ہیں۔ اُسی صبح گوہر کے سامنے ایک ایسا دلدوز واقعہ ہوا کہ اس کا رواں رواں کانپ اُٹھا۔

"حوالاتی پیٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا تھا اور تن پر کوئی ستر باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ایک سپاہی ہاتھ میں بڑا سا چمڑے کا لتر پورے جوش و جذبے سے وہاں ضرب لگا رہا تھا۔ جس کی حرمت پر S.H.O کے علاقے میں قتل بھی ہو جایا کرتے تھے۔ سپاہی اپنے من میں کلاسیفائیڈ سپشلسٹ تھا جب وہ پوری قوت سے ضرب لگاتا تو مضروب ایک جھٹکے سے اپنا سر اور اوپر والا دھڑ وہاں تک اُٹھا لیتا جہاں تک اس کے اعصاب اور ہڈیاں کام کرتی تھیں" (۴۶)

آخر میں کسی غلط فہمی کی بناء پر تھانے سے باہر ایس ایچ او اور ملک کامران کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے ملک کامران ایک سیاسی گھرانے کا چشم و چراغ اور گوہر کا شاگرد تھا۔ ملک کامران کو جب تھانے لایا گیا تو گویا ایک بھونچال آ گیا۔ بڑے بڑے وزیروں کی گاڑیوں کی لائنیں لگ گئیں۔ کامران بری ہوا تو ایس ایچ او کو معافی مانگنا پڑی۔ ملک کامران کی نظر جب اپنے استاد پر پڑی تو وہ غصے میں بپھر گیا اور ان کی رہائی کا حکم جاری کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشرہ صرف صاحب حیثیت لوگوں کو سر انکھوں پر بٹھاتا ہے مگر استاد جس کا احترام نہ صرف عام انسانوں کے لیے بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی نظر میں بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ اُس کو یوں رسوا کیا گیا۔ گویا جس معاشرے میں علم و عقل کی بجائے پیسہ اور عہدہ کو اہمیت دی جائے۔ وہاں ظلم ہی ظلم ہے کوئی سویر نہیں۔

احمد ہمیش کا کہنا ہے: ''افسانہ دوزخ میں اک پہر میں پولیس کی بدروح کو اسکیچ کیا ہے'' (۴۷)

اِسی طرح ڈاکٹر سید مصطفیٰ کریم کا کہنا ہے:

> ''دوزخ میں اک پہر'' پاکستانی تاریخ کے اس المیہ کی روداد ہے جس سے نجات کی صورت نظر نہیں آتی'' (۴۸)

بقول مولانا حکیم محمد صادق :

> ''ظالم حاکموں کی ستم رانیوں اور جھوٹی کارروائیوں کی تصدیق کرنے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والوں، ظلم کے حامیوں سے تو رسول اللہ ﷺ نے بیزاری کا اظہار فرمادیا ہے''(۴۹)

افسانہ ''بے نوا'' فخر و غرور، تکبّر اور انا کی بلند ترین مثال ہے کسی بھی معاشرے میں لوگ تکبر اور انا کی فصیلوں کو اتنا اونچا کر لیتے ہیں کہ ان کے باہر انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ ان فصیلوں کے باہر کی بسنے والی دنیا انہیں بہت چھوٹی اور حقیر نظر آنے لگتی ہے۔ اگر اس حقیر دنیا سے کوئی انسان اپنے قد کو ان فصیلوں سے بڑا کرنا چاہے تو اُس کے ساتھ اسی قسم کا ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ جس طرح کا ظلم افسانہ ''بے نوا'' میں ہوا۔ ''بے نوا'' ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے جہاں ذات پات اور نسل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں ملک فرمان اور اس کا دادا ہی صدیوں سے کمّی کمینوں پر اپنی حاکمیت جتاتے آئے ہیں۔ مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں

میں بھی شعور آ جانے سے حالات بدل رہے تھے۔ انہی کمیوں میں سے جب شیر محمد عرف شیرو ایک سیاسی پارٹی کا رکن بنا تو لوگوں میں یہ پہچانا جانے لگا۔ اثر ورسوخ والی برادریوں اور خاص کر ملک فرمان کے لیے یہ بات ہضم کرنا بڑی مشکل تھی۔ شیرو کے لیے سونے پہ سہاگا یہ کہ حکومت کی طرف سے کسب داروں کو پانچ پانچ مرلے کا پلاٹ بھی عطا کیا گیا۔ اس نئی بستی میں گھر بنانا اور رہائش پذیر ہونا شیرو کا بہت بڑا خواب تھا۔ شیرو کے باپ دادا بھی اپنی پوری زندگی انہی ملکوں کی چاکری کرتے آئے۔ مگر انصاف ان کے ساتھ بھی نہ ہوا۔ نئی بستی میں آباد لوگوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ واپس اپنی جگہوں کی طرف لوٹ جائیں۔ مگر شیرو نہ مانا۔

> ''شیرو نے پھر اپنے ملکیتی پلاٹ پر ڈیرہ جما لیا۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اس راز کو نہیں پا سکا کہ جس معاشرے کا وہ حصہ ہے۔ اس میں صدیوں سے قائم روایات سے انحراف در حقیقت اصل اقتدار اعلیٰ سے بغاوت کے مترادف ہے۔ ایسے لوگ سامنے آ جائیں تو ان شیریانوں میں دباؤ خطرناک حد تک بڑھ جاتا ہے جن میں نسلی خون دوڑ رہا ہوتا ہے شیرو کسی طور پر بھی باپ کے اڈے پر بیٹھ کر اپنا آبائی پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا'' (۵۰)

اپنی انا کی فصیل کو زمین بوس ہوتے دیکھ کر ملک فرمان اس کے دادا اور پولیس کے گٹھ جوڑ سے شیرو کو چوروں کے بین الاضلاعی گروہ کا سرغنہ قرار دے کر پکڑ لیا گیا۔ مگر شیرو اپنے نام سے بھی زیادہ شیر نکلا۔ اونچی ذات والے یہ بھول گئے تھے کہ ہر انسان ڈرپوک اور بھکاؤ مال نہیں ہوتا۔

> ''دوران تفتیش سارے ہتھکنڈے ناکام ہو چکے تو تفتیشی افسر کو یہ ضد سی ہو گئی..... کہ شیرو گڑگڑائے، التجا کرے، رحم کی اپیل کرے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے۔ لیکن ایذا رسانی کا کوئی نسخہ کارگر ثابت نہ ہوا..... ملزم کو مارتے مارتے اس کا سانس پھول جاتا۔ لیکن شیرو اطمینان سے پڑا رہتا۔ پولیس افسر کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ شیرو معافی نہیں مانگتا تو کسی ایسے زاویے سے اسے اذیت پہنچائی جائے کہ اس کے لبوں سے اُف یا ہائے کا کلمہ بے اختیار ادا ہو جائے۔ آنسو نہیں بہتے تو اس کی آنکھوں میں ایک نمی ہی تیر جائے۔..... وہ اپنی مظلومیت پر فریاد کیوں نہیں کرتا..... کراہتا نہیں..... ظلم کی دہائی کیوں نہیں دیتا'' (۵۱)

اُس آفیسر سمیت ملک فرمان کی انا کا بُرج بھی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ افسر نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا اور شیرو کو سخت اذیت مار پیٹ اور ظلم کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ افسانہ ہمارے بے رحم معاشرے کی من مانی، خود غرضی اور غرور کی داستان ہے۔ بقول پروفیسر محمد فیروز شاہ:

> ''بے نوا'' وہ افسانہ ہے جو بے نوا کی انا کو تکبر کی فلک بوس فصیل سے ٹکرا کر اسے ریزہ ریزہ کر دینے کا اٹل عزم کا عکس کا رہے۔ کوئی ظلم کوئی جبر اس کی آنکھ میں آنسو اور زبان پر فریاد نہیں لا سکتا'' (۵۲)

استحصال:

''محافظ'' مصنف کا ایسا افسانہ ہے جو دو پولیس سپاہیوں کی لمبی بحث سے شروع ہوتا ہے اور انہی کی باتوں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ دونوں کی ڈیوٹی ایک ایسی مہنگی بڑی مارکیٹ میں ہے جہاں بڑی بڑی گاڑیوں والے آتے ہیں اور ڈھیروں شاپنگ کر کے لے جاتے ہیں۔ بڑی چمکتی گاڑیوں اور امیر لوگوں کی شاہ خرچیوں اور ان کے بچوں کے رنگ روپ نیز امیر خواتین کے نت نئے سٹائل دیکھ کر وہ دنگ رہ جاتے ہیں۔ پورا دن اپنے افسروں کے خاندان والوں کا شاہانہ طرز دیکھ کر سوچ اپنے گھر اور بیوی بچوں کی طرف چلی جاتی۔ ''محافظ'' کے دو مرکزی کردار حوالدار اور دوسرا اسلم سپاہی ہے۔ حوالدار اسلم کو بتایا ہے کہ مہنگائی کی بدولت وہ پورا دن کسی نہ کسی کو پھنسانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ تاکہ دو پیسے ہاتھ آجائیں۔ کہنے کو تو یہ ''محافظ'' اور پولیس والے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان ماتحتوں کو کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ہر غیر قانونی کام میں یہ اپنے افیسروں کا ساتھ دیتے ہیں مگر پھر بھی وہ انہیں جوتی کی نوک پر ہی رکھتے ہیں۔

> ''چھتیس چھتیس گھنٹے ڈیوٹی ہر بڑے کالِتّر سر پر رات 'دن' دھوپ بارش سردی اور برف سواری نہ سر پر سایہ ہیٹ اور جیب خالی..... ٹریفک کی خلاف ورزی پر ذرا کسی کو روک لو تو اگے کسی قانون ساز اسمبلی کا ممبر، اس کا بھائی، بھتیجا، سالا، سالی بیگم، دوست یا چمچہ نکل آتا ہے اور بیچ چوراہے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ کیا قانون بنائیں گئے..... یہ سارے خود قانون شکن ہیں'' (۵۳)

افسانے میں دونوں ماتحتوں کی بحث سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر بڑے جرم میں یہ صاحب حیثیت اور صاحب اقتدار لوگ ملوث ہوتے ہیں۔ مگر اِن کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے لوگ غریب ماتحتوں کو بھی عزت نہیں دیتے۔ کرے کوئی اور بھرے کوئی کے مصداق افسانے میں بتایا گیا کہ بڑے لوگ رشوت اور قانون شکنی کے بدلے میں دنیا میں ہی اپنی جنت بناتے ہیں مگر چھوٹے لوگ کچھ نہ کر کے دنیا میں بھی دوزخ کا عذاب کاٹتے ہیں۔ اور آخرت میں بھی دوزخ۔ اسلم کہنے لگا۔

> ''سر جی! ہم سراسر گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں ہمارے ساتھ جو لوگ دوزخ میں جائیں گے، انہوں نے دنیا میں جنت کے نظارے تو کر ہی لیے ہیں۔ ہم یہاں بھی دوزخ میں ہیں اور آگے بھی دوزخ میں۔ ہمارا کیا بنے گا؟ حوالدار ہنس کر بولا فکر نہ کرو، ہمیں بڑا تجربہ ہو گیا ہے دوزخ میں رہنے کا لیکن ان کی ماں کو..... چیخیں ان کی نکلیں گی آگے چل کے'' (۵۴)

یہ وہ محافظ ہیں جن کے سامنے بڑے لوگ زِندگی کی ہر بہار کا مزہ لوٹ رہے ہیں مگر ان کے پاس عید والے دن کے لئے ہانڈی میں ڈالنے کو خاک بھی نہیں تھی۔ لوگ ان کو قربانی کا گوشت اس لیے نہ بھیجتے کہ پولیس والے رشوت خور ہوتے ہیں۔ لہٰذا قربانی کا گوشت اِن کو نہیں لگتا۔ آخر میں پچھلی عید کی کہانی سناتے ہوئے اور اپنی غریبی اور بے بسی کی داستان سناتے ہوئے حوالدار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسلم بولا۔

> ''سر جی! آپ رو رہے ہیں۔ دونوں چپ ہو گئے چند لمحوں کی خاموشی نے بازار کے رونق میلے، چہل پہل، شور و غل اور گہما گہمی کو نگل گیا۔ اور پھر شیر باز حوالدار کی آواز ایک طویل غوطے کے بعد سطح پر ہلکی لرزش سے تیر گئی۔ کیوں یار! میں انسان نہیں''(۵۵)

افسانے میں اقتصادی ناانصافی، امیر غریب میں تفریق کا رونا رویا گیا ہے۔ چاہے ماتحت ہوں یا بڑے آفیسر، غریب ہوں یا صاحب حیثیت بالآخر اللہ نے سب کو انسان پیدا کیا ہے۔ بقول احمد ہمیش:

> ''محافظ میں مصنف نے اہلِ اقتدار کے نچلے طبقہ کی خانہ ویرانی کا کچھ اس انداز میں نقشہ کھنچا ہے کہ ترس آنے لگتا ہے''(۵۶)

ایک انسان کے دوسرے انسان پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے حقوق اور فرائض کو پہچان لیں تو معاشرتی تضاد اور طبقاتی تفریق میں کسی حد تک کمی لائی جاسکتی ہے۔

افسانہ ''شاعر'' میں ایک ادیب کی معاشرے میں نام نہاد عزت و شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک ادیب اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنا کُل سرمایہ کتاب کی صورت میں ترتیب دیتا ہے مگر ہر بار معاشرے کی طرف سے اسے دھتکار اور بے حسی ملتی ہے۔ افسانے کا شاعر بھی ایک ایسا ادیب ہے جس نے بڑی محنت کی اور ساری امیدیں اس سے وابسطہ کیں۔ مگر اس معاشرے کا خاصہ ہے کہ محنت کوئی اور کرتا ہے اور پھل کسی اور کے حصے میں آتا ہے۔ شاعر جب ایک مشاعرے میں اپنی غزل پڑھتا ہے تو پبلشرز اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے اور اُسے شہرت اور دولت کا جھانسہ دیتا ہے۔ پہلے پہل تو پبلشر کا شاعر کے ساتھ ہمدردانہ سلوک رہا۔ مگر آہستہ آہستہ زمانے کے رواج کو مطابق سرد مہری اختیار کر لی۔

> ''اسٹام پر دستخط کر کے بیاض پبلشر کے حوالے کی اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔ اپنی روحانی اولاد کو خوبصورت پیرہن میں دیکھنے کی آس میں وہ ایک ایک دن گن کر گزارنے لگا۔ اس دوران وہ پبلشر سے ملاقات کی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ جب بھی کبھی کرائے کے لئے دس بیس روپے کسی ذریعے سے حاصل کر کے پہنچا تو سیکرٹری سے معلوم ہوتا کہ صاحب کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں۔ وہ انتظار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو اسے بڑی سرد مہری سے جواب دیا جاتا کہ آج وہ سیدھے گھر چلے جائیں گے''(۵۷)

پہلی اشاعت میں کتاب کی تعداد ایک ہزار بتائی گئی مگر اصل میں تقریباً دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی تھیں۔ کتاب لوگوں میں دن بدن مقبول ہونے لگی۔ مگر شاعر کو اپنی محنت کا کوئی پھل نہ مل سکا:

> ''شاعر کے تن پر وہی لباس تھا جو کم و پیش سات آٹھ سو مرتبہ دھل چکا ہو گا۔ ہر صبح اس کے کف کالر اور پتلون کی سلائی سے چُھوٹے ہوئے دھاگے قینچی سے کاٹنے پڑتے تھے۔ دن بھر لباس کے مسکنے کا دھڑکا سا لگا رہتا۔ پبلشر نے وعدہ نہ کیا تاہم اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر اس کی لاگت پوری ہو گئی تو معائدہ سے قطع نظر وہ شاعر کی مالی معاونت ضرور کرے گا''(۵۸)

مگر باوجود پبلشر کے دفتر کے بارہا چکر لگانے کے شاعر کے حصے میں رسوائی، دھتکااور نفرت ہی آئی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیں۔ مگر یہاں اتنی سر دردی، دماغ سوزی اور محنت کے باوجود شاعروں اور ادیبوں کے خون کا ہمیشہ ارمان ہوتا آیا ہے۔ اس سماج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کی لائقی، محنت اور کوشش کو(cash) کیش کر کے خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور اصل حق دار کو جوتی کی نوک پر رکھا جاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے دوسروں کے اندر شعور بیدار کرنے والے اور دوسروں کے اندر روشنی پیدا کرنے والے خود غربت اور ذلّت کے اندھیرے میں ہی رہتے ہیں۔ آخر میں بڑی جانفشانی سے پبلشر نے ملنے میں کامیابی ہوئی تو پبلشر سے اپنا اصل روپ دکھاتے ہوئے کہا۔

> ''پبلشر نے ہاتھ کے اشارے سے کرسی پیش کی اور ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، کیسے کیسے لوگ آجاتے ہیں.....بولا۔ آپ نے اس لیے صبح سے دفتر کا گھیراؤ کر رکھا ہے ۔ یوں تو قرض وصول کرنے والے بھی نہیں کرتے .....ہم Committedلوگ ہیں۔ خلوص دل سے آدب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ گم نام گوشوں سے بوریوں میں بند پڑے ایک طرح سے مردہ تخلیق کے روپ کو نکال کر زندہ کیا ہے.....اسی اثنامیں اس نے دراز کھولا۔ دس دس روپے کے کچھ نوٹ شاعر کی طرف بڑھائے اور کہا۔ یار کوئی کام وام میرا مطلب ہے۔ کچھ نہ کچھ کہا کرو''(۵۹)

مصنّف نے بتایا ہے کہ شاعر اور ادیب ہمیشہ اسی قسم کی عزت کماتے ہیں۔ اور اس طرح کی عزت سے نوازنا ہمارے سماج کا ایک خاص مزاج بن چکا ہے۔

بقول پروفیسر محمد فیروز شاہ:

> ''شاعر''علم اور ادب تمدّن میں سانس لینے والے اس تخلیق کار کا دکھ بیان کرتا ہے جو اپنے ماحول کے پرہول کو زبان دیتا ہے۔ جس کا ہاتھ عصر کی نبض پر ہوتا اور جس کی آنکھوں میں آنے والے زمانوں کا عکس تیرتا ہے.....ثروت مند رعونت اس کی تخلیقی متاع کی قدر افزائی یوں کرتی ہے کہ ثمر شیریں اپنے دامن میں ڈال لیتی ہے اور خزانہ جس کا ہوتا ہے وہ زمانہ کا منہ دیکھتا پھرتا ہے''(۶۰)

محمد الیاس نے اپنے افسانے ''سانولی سلونی'' میں بھیڑ بکریاں چرانے والے دو بھائیوں عطنہ اور پھتنہ کی دلسوز کہانی خوبصورت انداز سے پیش کی ہے۔ جو بکریاں چراتے ہوئے گیت گاتے تو ان کی درد بھری آواز سننے والوں کو غم سے معمور کر دیتی۔ ان کا مختصر سا خاندان تقریباً ایک گاؤں میں سو سالوں سے قیام پذیر تھا۔ ماضی میں انہی کے خاندان کے ایک محنتی لوہار غلام رسول نے انگریز لفٹیننٹ صاحب کے گھوڑے کے نعل نہ لگانے پر حکم عدولی کی۔ انگریز کے گلام بولنے وہ طیش میں آ گیا اور اس کا قتل کر دیا۔ خود اکلوتی بیٹی کو ایک چرواہے کے حوالے کر کے روپوش ہو گیا۔ مگر ملک حاکم خان کی مخبری نے اسے تختہ دار تک پہنچا دیا۔ اب اُس کی بیٹی کی نسل میں دو لڑکیاں سانولی سلونی جوان ہو چکی تھیں۔ جو عطنے پھتنے کے ساتھ منسوب کر دی گئیں۔ مگر دلوں کی رنجش وقت کے ساتھ ختم نہ ہوئی بلکہ اس آگ میں کئی نسلیں برباد ہوئیں۔ عطنہ و پھنہ چونکہ غریب اور لاچار تھے اور ملک حاکم کا ایک سیاسی اثر ورسوخ تھا اور اُس پورے گاؤں میں اُس کا ڈنکا بجتا تھا۔ جب بھی یہ خاندان آمنے سامنے ہوئے تو ماضی کے واقعات ان کو بہت کچھ یاد کروا دیتے۔ ملک حاکم کے پوتے سانولی سلونی کو اٹھا کر کوٹھی میں لائے اور ان غریبوں کی عزت ایک دفعہ پھر تار تار ہو گئی۔ عطنہ پھتنہ جوانی کے جوش میں اور انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ لہٰذا اب ان کی باری تھی کوٹھی میں آنا ان کے لیے نحس ثابت ہوا۔ پولیس کو بلا لیا گیا اور کچھ نہ کر کے بھی موردِ الزام ٹھہرے۔ دونوں کے بیان سننے پر خان بہادر خان کی گرفتاری کا بھی حکم ہوا تو۔

> ''تہلکہ مچ گیا اور انتظامیہ ہل گئی۔ صوبائی حکومت کے ستون تھر تھر کانپنے لگے۔ اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش ہوئی..... ایک طرف علاقے کا سیاسی راہنما، حکومت کا ستون انگریز کے زمانے کا معزز خان بہادر، دوسری جانب چرواہے۔ بھلا ملک سردار خان کی بیٹی اور سانولی سلونی دونوں، جنگل کے باسی دو گنوار لڑکیوں کے ساتھ ایک ترازو میں برابر تُل سکتی ہیں'' (۶۱)

ہر کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا جیسے کوئی انہونی واقعہ ہونے جا رہا ہو کہ غریب کے ساتھ امیر کو بھی سزا کیوں؟ ایسے معاملات میں جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ غریب کا پلڑا ہلکا اور امیر کا پلڑا بھاری رہا۔ اور تھانیدار کی تبدیلی کروا کر اپنی مرضی کا تھانیدار تعینات کروایا گیا۔ جس کی نئے سرے سے تفتیش نے خاطر خواہ نتائج برآمد کیے۔ عطنہ اور پھتنہ اور ان کی منگیتریں چوری کے جرم میں اندر ہو گئے اور سزاوار ٹھہرے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر

غریب کی عزت پائمال نہ ہو۔ اُس کو کچلا نہ جائے تو پھر زمانے میں امارت کا بول بالا کیسے ہو۔ اور لوگوں کی واہ واہ سے امیر کا شملہ کیسے اونچا ہو اور غریب زمین پر ماتھا رگڑے۔ یہ معاشرتی تفاوت کیسے پیدا ہوا اگر امیر حاکمیت نہ جتائے اور غریب غلام نہ بنے۔ اسی امارت اور غربت نے ہمارے معاشرے کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔

> ''لہٰذا دورانِ تفتیش کچھ تھرڈ گری ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑے۔ دونوں کے سامنے، لڑکیوں کو بے لباس کیا گیا۔ اور جلتی ہوئی دیا سلائیوں سے فاضل بال جلا ڈالے گئے نوجوان لڑکوں کے دماغ میں پرورش پانے والے بغاوت اور شر کے جراثیم یکسر نیست و نابود ہو گئے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر دونوں لڑکوں کو مردانہ صفات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا..... ملک سردار خان کوئی ایسا بھی ظالم شخص نہیں تھا۔ فادر آف دی سٹی کہلاتا تھا۔ لڑکیوں کو اپنی سرپرستی میں لے کر اسی کوٹھی پر رکھا گیا۔ جہاں ان کے ساتھ غیر اخلاقی فعل ہوا تھا اور لڑکوں کو بابو تھیڑ کے حوالے کر دیا..... لڑکوں نے بقیہ زندگی تھیڑ کے نام کر دی'' (۶۲)

افسانہ طبقاتی تفریق کو سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔ جس میں غریب گونگا ہے اور ہر طرف امیر کا ہی راج ہے۔

عورت کا استحصال :

افسانہ ''لُنڈا اور ٹنڈا'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں جانوروں کی مثال دے کر مصنف نے انسانوں کی حقیقت سمجھائی ہے۔ لُنڈا ایک آوارہ کتا اور ٹنڈا ایک آوارہ انسان۔ ٹنڈا انسان ہونے کے باوجود لنڈے سے بہت ملتا جلتا تھا یعنی دونوں کی بہت ساری باتیں مشترک تھیں۔ دونوں اپنے علاقے کے بد معاش تھے اور دونوں نے اپنی اپنی ذات برادری میں بد معاشی قائم کر رکھی تھی۔ خالدہ ٹنڈے کی بیوی تھی محنت اور مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی۔ جبکہ ٹنڈا آلسی، بے غیرت و گھٹیا اور انتہائی کمینہ انسان تھا۔ جو ہمیشہ اپنی بیوی کو پیسوں کے لیے مارتا پیٹتا۔ گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے مگر پھر بچوں کی ایک پوری فوج تھی۔ مگر چونکہ عورت بے بس تھی کہ خاوند کو کسی بات سے منع کرتی۔ خالدہ اپنی مالکن سے بولی :

> ''جی! میں کیا کرو، ہاتھ جوڑتی ہوں، واسطے دیتی ہوں عورت ذات ہوں وہ مرد ہے، کہتا

ہے اللہ پالن ہار ہے۔ نہ مانوں تو مار تا ہے" (۶۳)

ٹنڈا اپنے محنت مزدوری کرنے والے بیٹے کو بھی مار تا۔ دوسری طرف خالدہ کی مالکن کے گھر لنڈا (کُتّا) بھی اپنی ڈیوٹی پر رہتا۔ ادھر ہی لُوسی (کتیا) بھی آتی جاتی۔ جب لُوسی ماں بن گئی تو مالکن نے اُس کی بڑی خدمت کی۔ لیکن اُس برآمدے میں لنڈا پہرے داری دینے بیٹھ گیا جیسے کہ باپ بننے کے بعد اُس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر لیا ہو۔ لیکن اب کی بار خالدہ پھر ماں بنی تو مالکن نے پہلے تو بہت سرزنش کی پھر اُسے آرام کرنے کے لیے کہا۔ افسانے میں عورت کی کمزوری اور مرد کی مردانگی کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ باپ بننے کے احساس نے ایک جانور کو تو بچوں کی محبت میں مبتلا کر دیا اور لُوسی کی پھٹکار پر چپ ہو جاتا مگر ٹنڈا اشرف المخلوق ہونے کے باوجود خالدہ کو کبھی وہ مقام نہ دے سکا۔ جس کا وہ حق رکھتی تھی۔

> "لُوسی معمول کی ہوا خوری کے لیے شمالی سمت والی جھاڑیوں میں کہیں غائب تھی۔ برتن میں دودھ ڈالا گیا تو لُنڈا دوڑتا ہوا اُن کے سروں پر آن پہنچا..... ایک پلّا کُچھ زیادہ ہی دردناک آواز میں چلایا تو لُوسی بھاگتی ہوئی آئی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ پنجے جھاڑ کر اپنے سر تاج پر حملہ آور ہو گئی..... لُنڈا ایک بار ہلکے سے غرّایا، چند قدم ایک طرف سرکا۔ اور انہی پاؤں پر گھوم کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ پلکیں اُٹھا کر ایک نظر بچوں اور بچوں والی کو دیکھا اور پھر اطمینان سے گردن نیچے ڈال دی" (۶۴)

جب ایک عورت ماں بنتی ہے تو اُس کا ادب، احترام اور وقار بڑھ جاتا ہے۔ مگر ٹنڈا بد معاش ہر وقت خالدہ کی عزت کی دھجیاں اُڑاتا اور جانور سے بھی بدتر سلوک کرتا۔ افسانہ میں طنزیہ لہجہ اور انداز موجود ہے۔ خالدہ زندگی کے اتنے برس صرف عورت ہونے پر پٹتی رہی مگر ٹنڈا کی مردانگی کے زعم کو کبھی نہ کم کر سکی۔ افسانہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا عورت انسان ہے یا جانور جس کی عزت مقام، جذبات و احساسات کو کوئی آج تک نہ سمجھ پایا۔

بے حسی :

مولانا حکیم محمد صادق صاحب کا کہنا ہے:

"حلال کا رزق کھانے سے نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق ملتی ہے اخلاق بلند ہوتے ہیں

سیرت سنورتی اور کردار نکھرتا ہے" (۶۵)

بعض دفعہ انسان اپنے اچھے اخلاق، رویے اور عادات سے غیروں کے دل بھی جیت لیتا ہے۔ لیکن اگر اسی اخلاق میں بے حسی، کھوٹ اور چوری شامل ہو تو وہ اپنی اولاد کو بھی تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اِنسان دنیا میں اپنے انہی روّیوں اور عادات سے بلند مقام بھی حاصل کرتا ہے اور انہی کے بگڑ جانے سے پستی کے گڑھے میں جا گرتا ہے افسانہ "نیلام" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ثمینہ کے ماں باپ معاشی لحاظ سے تو اتنے مستحکم نہیں ہیں مگر اپنی اداؤں، ظاہری رکھ رکھاؤ اور باتوں میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ ثمینہ ایک انتہائی خوبصورت دوشیزہ جس کو رشتوں کی کمی نہیں مگر اس خوبصورتی کے باجود اُس کے ہاں اُس محلے کے مطابق ہی رشتے آتے۔ جو اس کے ماں باپ کو پسند نہ آئے۔ آخر طالب حسین رشتہ داری کے لیے چُن لیا گیا۔ جو کہ بڑے شہروں میں سینٹری کی دوکانوں پر کئی طرح کی Items سپلائی کرتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی سے اختلافات کی بناء پر الگ ہو گیا۔ ماں باپ دونوں کافی عرصہ پہلے چل بسے تھے۔ طالب حسین کی پہلی دو بیویاں کسی نہ کسی وجہ سے اُس کا ساتھ نہ دے سکی لہٰذا علیحدگی ہو گئی۔ طالب حسین ثمینہ سے عمر میں بڑا ہونے کے باوجود ثمینہ کے ماں باپ کو پسند آ گیا لہٰذا اُسے اپنی فرزندی میں قبول کر کے اُسے اپنا بیٹا بنا لیا گیا۔ حرص اور لالچ انسان کے اندر سے رشتوں کا تقدس اور احترام ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا ثمینہ کے ماں باپ کی نظر اب بیٹی کا گھر بسانے میں نہیں بلکہ طالب حسین سے پیسہ ہتھیانے پر تھی۔

> "سسر صاحب نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھ لی اور محض داماد کے بہت سے کام سنوارنے کی نیت سے دونوں میاں بیوی شہر بھر میں گاڑی دوڑاتے پھرتے ..... دس ماہ کی مدت میں شہر سے ملحقہ جدید رہائشی علاقے میں کنال کنال کے دو پلاٹ خرید لیے۔ ایک ثمینہ کے نام یعنی طالب حسین کے لیے اور دوسرا اپنے بیٹے عامر کے لیے..... بیٹی کا جہیز بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ساس اور سسر نے مشورہ دیا۔ گلی محلے کی زندگی کے ساتھ بہت سی آلائشیں لپٹی ہوتی ہیں..... اس گندی سماجیات میں لتھڑے ہوئے ماحول سے باہر نکلو۔ صاف ستھرے ،۔۔۔۔ پُر فضا، آلودگی سے پاک جدید سہولتوں سے آراستہ علاقے میں گھر بناؤ" (۶۶)

شادی کے دوران عامر نے طالب حسین کے کاروباری معاملات سنبھال لیے۔ بروقت وصولیاں تو ہوتی رہیں۔ مگر پھر بھی طالب حسین کو خسارا ہوا۔ عامر نے بروقت وصولیاں نہ ہونے کا بہانہ بنایا۔ ساس سسر نے نئے پلاٹ پر عامر کا گھر بنوایا اور خود طالب حسین کی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے۔ بیٹی کو ادھیڑ عمر کے مرد کو نیلام کر کے اُس کے بدلے بہت کچھ خرید لیا۔ مگر ثمینہ پھر بھی اپنے خاوند کا ساتھ دیتی رہی۔ جب مال کی سپلائز متاثر ہونے پر دکانداروں نے طالب حسین سے شکایت کی اور گاڑی کی چابی طلب کی تو حقیقت سامنے آئی۔

> ''رات کو آٹھ دس چھوٹے بڑے قرض خواہوں نے ایک ساتھ گھر آ کر گھیراؤ کر لیا۔ ان کے تیور دیکھتے ہی طالب حسین کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنے والوں میں سب سے موٹے، عمر رسیدہ اور پہلوان ٹائپ کارخانہ دار نے طالب حسین کے سالے اور سسر کو بھی حاضر کر لیا اور بڑے دبنگ لہجے میں طالب حسین کو کہا، دیکھ اوئے بھائی! جان چھڑا اِن جونکوں سے، تمہارا قیمہ کر کے کھا جائیں گئے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ سمجھ پھر وہ براہ راست اُس کے سسر سے مخاطب ہوا بس کر یار! بدہضمی ہو جائے گی۔ اپھارہ ہو جائے گا..... ترس کھا اس یتیم پر'' (۶۷)

طالب حسین کو دل کے دورے نے ہسپتال پہنچا دیا۔ جب ثمینہ ہسپتال جانے لگی تو ماں باپ نے کہا کہ مت دے اُس کا ساتھ، ہمارا ساتھ دے تو اب عیش کرے گی کیوں کہ کمی اب ان کے ہاں بھی نہیں۔ ثمینہ نے یہ کہہ کر ان کی بولتی بند کر دی کہ اب وہ دوبارہ نیلام پر نہیں چڑھے گی۔

''نیلام'' ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے۔ جنہوں نے بیٹی کو نیلام پر چڑھا کر حرام سے آسودگی چاہی مگر اُس کار شتوں پر سے اعتبار ختم کروا گیا۔ ''نیلام'' کئی اپنوں کے اصلی چہروں کا ظاہر کر گیا۔

''عظیم فلاحی مرکز'' اس افسانے میں ایوانِ اجل کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ایوان اجل علامت ہے ہمارے ملک کے ایوانوں میں بیٹھے اُن سیاستدانوں اور صاحبِ اختیار لوگوں کی جو ایوانوں میں بیٹھ کر ایسے فیصلے کرتے اور منصوبے بناتے ہیں جن کا تعلق عوام کی زندگیوں سے ہوتا ہے۔ مگر شروع سے لے کر آج تک انہوں نے جو بھی فیصلے کیے اُس میں ان کا اپنا فائدہ اور لالچ زیادہ پیش نظر رہا اور عوام کی خواہشات و ارمانوں کا ہمیشہ خون کیا گیا۔ دن بدن مہنگائی اور غربت سے لوگوں کی زندگی بے سکون ہوتی گئی۔ لہٰذا مصنف کے بقول اب یہ ایوان ایوانِ اجل کا کام سرانجام دینے لگا۔ لوگوں کے اندر زندگی جینے کا چونکہ اب کوئی جواز

باقی نہ رہا۔ لوگ موت کو ہی راہ فرار سمجھ کر جینے پر مرنے کو ترجیح دینے لگے تو عوام کو زندگی کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے اس ایوان اجل نے ہر طرح کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

> ”صاحب اختیار نے ہمدردی کا عملی ثبوت پیش کیا اور معتمد ساتھیوں پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی تشکیل دی۔ جس نے خودکشی کے خواہش مندوں کے اعداد و شمار جمع کیے اور منصوبے کے قابل عمل ہونے کی ایک جامع رپورٹ پیش کر دی“(۶۸)

لہٰذا اتنے بڑے منصوبے کو جلد ہی کامیابی نصیب ہوئی کیوں کہ جینے کا سامان تو تھا نہیں تو مرنے والوں کی دھڑا دھڑ قطاریں لگنا شروع ہو گئیں۔ مرنے والے اس عظیم فلاحی مرکز میں ہر طرح کی سہولتوں سے بڑے خوش تھے۔ بقول مصنّف:

> ”جدید اور قدیم ہر نوع کا سامان خودکشی یہاں فراہم کر دیا گیا تھا۔ جس انداز میں چاہے موت کو گلے لگا سکتا تھا۔ وسیع رقبے پر قائم یہ مرکز بہت سے شعبوں پر مشتمل تھا“(۶۹)

خودکشی کرنے کیلئے اسلحہ سے زندگی ختم کرنی ہو یا گہرے پانی میں چھلانگ لگا کر مرنا ہو، گلے میں پھندا ڈالنا ہو یا انجکشن کے ذریعے موت کو گلے لگانا ہو اس مرکز میں ہر طرح کی سہولت بہم درکار تھی۔

> ”جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نکلوا کر زندگی کا خاتمہ کرنے کا سامان بھی مہیا کیا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص عین وقت پر موت کے خوف سے لرز جاتا تو وہ ایک ایسے شعبے میں پہنچ جاتا جہاں بھوکے درندے اسے لقمۂ تر بنانے کے لئے خونی جبڑے کھولے منتظر ہوتے۔ گویا ایوانِ اجل میں داخل ہونے کا انجام یقینی موت تھا“(۷۰)

موت کے طالب گار روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ لہٰذا اس منصوبے کو مزید وُسعت دی گئی۔ اب عوام اور ایوانِ اجل دونوں پر سکون اور مطمئن تھے۔ مصنف نے عظیم فلاحی مرکز جیسے افسانے میں بہت خوبصورت اور سادہ انداز میں عوام کی تکلیفوں اور ایوان کے حاکموں کی من مانیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ سیاستدان اپنے فیصلوں سے لوگوں کی زندگی کا دائرہ تنگ کر کے آخر کب تک خوش اور مطمئن رہ

سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے ان فیصلوں میں خود ان کی ذات اور ان کی اولادیں متاثر نہیں ہوتیں لہٰذا کسی کا مرنا یا جینا ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مگر ایک دن انسانوں کے اس گروہ کی پکڑ اس ذات کے ہاتھوں ضرور ہو گی جو ہر طرح کے فیصلے پر قادر ہے۔ بے آسر، بے بس اور بے سہارا کی آہ و فریاد ایک دن عرش کو ہلا کر رکھ دے گی۔ تو پھر یوں ہی ہو گا۔

> ''اوائل میں اقتدار اور اجل کے ایوانوں میں اطمینان کی سی فضا قائم رہی۔ آشفتہ دل، زخمی روحیں اٹھائے دریدہ بدن ایک طرح سے آسودہ خاک نظر آنے لگے کہ وہ مسلسل جیے جانے کا جبر سہنے پر مجبور نہیں رہے تھے۔ لیکن طمانیت کی فضا کو تادیر ثبات میسر نہ رہا۔ آشفتہ سری فتنہ ۔۔۔ اور آشوب محشر بیا ہوا۔ کچلے اور مسلے ہوئے بدن بھڑک اُٹھے تو عظیم فلاحی مرکز آن کی آن میں مسمار کر ڈالا۔ وہی عناصر جن پر مقہور نسلیں مدتوں زندہ رہی تھیں۔ صاحبانِ اختیار کی طبع نازک پر قہر کی صورت اثر انداز ہوئے۔ ایوانِ اجل میں پڑے اعضا اور اجزاء سے ایک وائرس پھوٹ پڑا جو مقتدر ایوانوں میں اجل کی صورت نازل ہوا۔ تو عظیم الشان محلوں میں سناٹا چھا گیا''(۷۱)

افسانہ ''کفایت''میں اُس معاشرتی بے حسی کا رونا رویا گیا ہے۔ جس میں لوگ اپنے بزرگوں اور بوڑھے ماں باپ کو بوجھ تصور کرنے لگتے ہیں۔ اپنی اولاد کی خواہشات کے لیے جان وار دیتے ہیں مگر بوڑھے ماں، باپ کے لئے ایک روپیہ خرچ کرنے سے ان کی جان جاتی ہے اور کفایت شعاری کا جنون چڑھ جاتا ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی المیہ اور اخلاقی بے حسی ہے کہ استطاعت نہ ہونے کے باوجود ماں باپ کی خوشی کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ ڈالتے ہیں مگر وہی اولاد انہیں وبالِ جان تصور کرتی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ''اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی ہے''(۷۲)

افسانے کا مرکزی کردار بڑے میاں ہیں جن کو اب عام ٹائلٹ کی بجائے کموڈ کی ضرورت ہے۔ بیٹے کو کئی دفعہ گوش گزار کروایا گیا مگر ہمیشہ مہنگائی کا رونا رویا جاتا۔ اور کفایت شعاری کی بات کی جاتی۔ لہٰذا بڑے میاں نے اب کوئی ضرورت ظاہر کرنے اور گھر والوں کو مزید تنگ نہ کرنے کی غرض سے چپ سادھ لی۔ نتیجتاً اُن کے اِس طرزِ عمل کو خود غرضی کا نام دیا گیا۔ گھر کے اس گھٹن زدہ ماحول سے تنگ آکر میاں صاحب زیادہ

وقت مسجد اور محلے کی دکان پر اپنے ہم عمر لوگوں کے ساتھ گزارتے۔ باپ کی تنہائی دُور کرنے کے لیے بیٹے کے پاس وقت تھا نہ خرچ کرنے کے لیے پیسے۔

''پوتے نے اولیول میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تو گھر میں بڑی خوشی منائی گئی۔ آئندہ کے لیے اسے الگ سے آراستہ و پیراستہ کمرا دینے کی منصوبہ بندی ہونے لگی تا کہ وہ آرام اور کامل یک سائی سے اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ وہ بہو اور بیٹے کی گفتگو کئی بار سن چکا تھا۔ جو دراصل اسے سنانے کے لیے ہی کرتے تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کے زیر استعمال کمرا بہت جلد خالی کرنا پڑے گا۔ چونکہ گھر میں پوتے کے لئے سب سے مناسب جگہ وہی ہے''(۷۳)

بر آمدے کے آخر میں ایک نیا کمرا بنوایا گیا۔ بہت قیمتی اور مہنگا فرنیچر منگوایا گیا۔ بڑے میاں دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ صرف کموڈ کا کہا تھا۔ اور اتنا خرچہ کر ڈالا۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ وہ سارا خرچہ تو بیٹے کی آسائش کے لیے کیا گیا جب کہ بر آمدے والے کمرے میں پرانا فرنیچر اور باتھ روم کے لئے سیکنڈ ہینڈ چیزیں بڑے میاں کو سونپی گئی۔ پرانے فرنیچر کو دیکھ کر بڑے میاں کا ماضی ان کے سامنے کھڑا ہو گیا جب وہی پرانا سیکنڈ ہینڈ فرنیچر نیلام سے اپنے والدین کے لئے خرید کر لائے تھے۔ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ یہاں کچھ اعمال کا فیصلہ کرنے میں اللہ کی ذات دیر نہیں لگاتی۔ تا کہ انسان اپنی غلطیوں سے عبرت حاصل کرے۔ مگر وہی غلطیاں دہرانا انسان کی سرشت بن چکی ہے۔

''کپکپاتے ہاتھوں سے پلنگ کو سہلاتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے بدن سے جان ٹوٹ رہی ہے۔ وہ پلنگ پر دراز ہوا اور جوانی کے دور سے بھی پیچھے مزید تیس، پنتیس سال ماضی میں اُتر گیا..... اچانک بہو اور بیٹے کی آواز آئی یہ رقم زیادہ ہے ایک ہاتھ پر اٹھائیس ہزار روپے..... ابھی اس کی فیس اور داخلہ جمع کروانا ہے..... بیٹے سے زیادہ کون سے شے قیمتی ہے۔ ابا جی کے ہاتھ پر کتنا خرچ اٹھا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ سارا سامان پرانے ہاتھ والا کام آ گیا ہے۔ کموڈ سیکنڈ ہینڈ ہے۔ دکاندار نے چار سو روپے بل میں ڈال رکھے تھے۔ میں نے کاٹ لیے بس وہی اٹھائیس ہزار ہی دیا ہے''(۷۴)

جن رشتوں میں خود غرضیاں شامل ہو جائیں اور فائدہ اور نقصان حائل ہونے لگے۔ ان گھروں میں ویرانی ڈیرے جما لیتی ہے۔ ایسے لوگ اللہ کی رحمت سے ہمیشہ مایوس رہتے ہیں اور بد بختی اور نحوست ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ بزرگوں کا احترام اور خیال کرنے سے خوشیاں دروازے پر دستک دیتی ہیں۔
بقول سلیم بن عید الہلالی:

''نبی ﷺ نے بھی والدین کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی پر تنبیہ کی ہے''(۷۵)

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی فرماں برداری صرف ایک مذہبی نیکی ہی نہیں ایک معاشرتی خوبی بھی ہے جس کے ہونے سے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اُن سے حسن سلوک معاشرے میں ایثار، ہمدردی اور محبت کے جذبات کو جنم دے گا۔ لیکن جس کے نہ ہونے سے سگے رشتوں میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔

ب۔ ''دوزخ میں اک پہر'' اور ''منظر پس غبار'' میں سماجی حقیقت نگاری کے تناظر میں اخلاقی زوال کی صورتحال:

محمد الیاس کے پہلے دو افسانوی مجموعوں ''لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں'' اور مور پنکھ پر لکھی آنکھیں'' کی طرح ان دو مجموعوں کے موضوعات بھی زیادہ تر بد عنوانی، نا انصافی، استحصال وغیرہ ہی ہیں۔ اگر ہم ان موضوعات میں سے اخلاقی زوال کی ایک صورت ظلم و ستم کی بات کریں تو وہ دور جمہوریت کا ہو یا مارشل لاء کا انسان دوسرے انسان کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا ہے۔ خاص طور پر مصنف کا افسانہ ''دوزخ میں اک پہر'' میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کا جس طرح سے نقشہ کھینچا گیا ہے اُس میں سوائے سچ کے کہیں بھی جھوٹ کی آمیزش نہیں لگتی۔

یہ افسانہ پڑھ کر ہمیں لا قانونیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ انسان جب ناجائز مال و دولت کی فراوانی اسے اپنے آپ کو مضبوط کر لیتا ہے تو وہ لوگوں کے ضمیروں کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی جگہ عام انسان کو اظہارِ رائے کی آزادی نہیں دی جاتی۔ چونکہ وہ خود قانون کے رکھوالے ہیں تو مواخذہ صرف عام شہری کا ہوتا ہے۔ ان کا نہیں۔ ان کے ماتحت عملہ ان کی خواہشات کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں غرض یہ

افسانہ بتاتا ہے کہ ہر طرف لا قانونیت ہی لا قانونیت ہے۔ پولیس کا محکمہ اپنے انہی کرتوتوں کی وجہ سے بدنام ہوتا آیا ہے ان کا یہ افسانہ گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''بے نوا'' میں ذات پات کے نام پر ظلم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ موضوعات کسی کے لیے بھی نئے نہیں کیوں کہ ہماری نسل نے انہی حالات میں آنکھ کھولی ہے۔ جہاں طبقاتی تفریق کو قائم رکھنے کے لیے، ظلم کیا جاتا ہے۔

بد عنوانی کے تحت لکھے گئے افسانوں میں بتایا گیا ہے کہ شعبہ چاہے کوئی بھی ہو۔ سیاست کا شعبہ ہو یا ڈاکٹروں کا، ہر جگہ بد عنوانی کا سکہ رائج نظر آتا ہے اور لُوٹ مار اور حرص ولالچ کمتر اور غریب کے ہاں ہی نہیں بلکہ اونچے اعلیٰ طبقے کے لوگ اس بیماری میں زیادہ مبتلا نظر آتے ہیں۔

جن افسانوں میں منافقت کا پہلو موجود ہے جسے ''درآمدی مہر'' اور ''ملمع''، ''درآمدی مہر'' میں مصنف نے تجارتی کاروبار میں نازیبا قسم کی کمینہ فطرت شخصیت کو سامنے لایا ہے، زیادہ تر کاروباری لوگوں کی یہی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ زیادہ نفع کمائیں اور ناقص دے کر اعلیٰ وعمدہ مال کے پیسے وصول کریں۔ اس افسانے کے ذریعے ہمارے معاشرے اور انسانیت کو ہلاکت میں ڈالنے والے معاشی عوامل میں شامل ایک عیب کو سامنے لایا ہے، جب انسان کسی شے میں ملاوٹ کرتا ہے تو وہ دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور انسانوں کا یہ عمل معاشی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ آج کل اسی عادت کو کاروبار میں نفع حاصل کرنے کا زبردست ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اسلام میں انسان کی اس بُری، گھٹیا و قبیح حرکت کو سخت ناپسند قرار دیا ہے۔

حدیث ہے:

'' من غش فلیس منا''

''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں''(۷۶)

ایسے افسانے ہیں جن میں پاکستانی قوم کی نفسیات کو سامنے لایا گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے مسابقت کا جذبہ زور پکڑ چکا ہے۔ دھوکا دہی جیسے ہتھیاروں کا پاس ہونا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس دوڑ میں انہی ہتھیاروں کو دھوکا دینے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ اور پاکستانی قوم بڑی آسانی سے اس شکنجے میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

عورت کا استحصال یہاں بھی موجود ہے مگر ان مجموعوں میں استحصال کی زد میں آنے والی عورت کے اندر سرکشی کا معمولی جذبہ بھی موجود نہیں۔ اور یہ عورت واقعی لاچار اور بے بس ہے جو اپنے حق کے خلاف آواز اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ افسانہ ''نیلام'' میں مصنف نے زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار کو سامنے لایا ہے۔

اور ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے جن اقدار و روایات سے ماضی میں کبھی جڑے رہنا ہی زندگی کا حسن کہلاتا تھا اب وہ کھوکھلی ہو کر مٹتی جارہی ہیں۔

''عظیم فلاحی مرکز'' جب معاشرتی زندگی کی ضروریات اور حاجتوں کو پُورا کرنے کے لیے مختلف اداروں کی ضرورت پڑی تو متعلقہ ادارے قائم ہونے لگے انہی میں سے ایک ادارہ حکومت کا ادارہ تھا، جو صرف ذاتی مقاصد پورے کرنے کے لیے یا صرف بیرونی دشمنوں سے تحفّظ کے لیے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ اس کا بڑا مقصد عوام کی زندگی کو بہتر بنانا، انہیں ضروریات زندگی مہیّا کرنا اور ملک کو ترقیاتی منصوبوں پر چلانا تھا۔ لیکن جب اِن اداروں میں غیر صالح، خود غرض اور انا پرست لوگ زبردستی قابض ہو گئے تو وہی ادارے عوام کی بے بسی لاچارگی اور غلامی کا سبب بنے۔

اِس افسانے میں بڑے خوبصورت انداز میں طنزاً بتایا گیا ہے کہ انسانوں کو دکھوں سے فلاح پانے کی راہ مل گئی اور اس تکلیف دہ زندگی سے چھٹکارا دلانے والوں کو دعائیں دیتے نہیں تھکتے۔ جنہوں نے ان کا بوجھ کم کیا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ہمارے حکمرانوں اور ملک کے غیر یقینی حالات، غلط پالیسیوں اور دگرگوں حالات کا انکشاف کیا ہے اور پِستی عوام کا نقشہ بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

ان افسانوں میں موجود کہانیوں کے ذریعے مصنّف نے ہمارے سماج کی اُس حقیقت کو عیاں کیا ہے جس کو لوگ کو محسوس تو کرتے ہیں مگر بولنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ محمد الیاس نے اپنے ہی اردگرد، اپنے ہی ماحول میں موجود عادات واطوار، روّیوں، ذہنی ونفسیاتی کیفیات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دونوں افسانوی مجموعوں کے موضوعات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنّف نے زیادہ تر انہی موضوعات کو چنا جو کہ ہمارے ہاں اخلاقی زوال کا سبب بنتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ مصنّف نے نظر کی گہرائی اور باریک مشاہدے سے ایسے موضوعات کو احاطہ قلم میں لایا جو بظاہر بہت سیدھے سادے اور عام فہم سے لگتے ہیں لیکن صرف انہی چیزوں سے ہم اپنی زندگی کو پاک کر دیں تو ہماری معاشرتی اقدار ٹوٹنے سے بچ جائیں ہم اپنی نسل کو بناوٹ سے پاک ایک فطری اور نکھرا ہوا ماحول دیں تو وہ دین و نیا دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انہی چیزوں کی طرف توجہ دلانا مصنف کی غرض وغایت بھی ہے۔ چونکہ مصنف کی پہلی وابستگی سچ کا ساتھ اور جھوٹ اور منافقت سے انکار ہے۔ مصنف نے خود بھی ہمیشہ بناوٹ سے پاک اور نمائش سے دور زندگی گزاری، یہی وجہ ہے کہ ان کے ان چاروں افسانوی مجموعوں میں بھی زیادہ (Focus) یہی موضوعات رہے۔

لیکن جس معاشرے میں یہی روّیے تسلسل سے آگئے بڑھ رہے ہوں تو وہاں زندگی اپنی اصل لذت سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہاں کے سماج کو تہذیب یافتہ کہنا گویا خود کو دھوکا دینا ہے اور ظلمت کو ضیاء لکھنے کے مترادف ہو گا۔ ان تمام مسائل کا تعلق چونکہ زیادہ تر معاشی عوامل سے ہے تو ہر شخص کو انفرادی طور پر لالچ سے اجتناب کرتے ہوئے حلال کی برکت کو سمجھتے ہوئے حرام روزی کے نقصان کو سمجھنا ہو گا۔ بقول حافظ صلاح الدین یوسف: ''انسان اگر چاہتا ہے کہ اس کی عبادات قبول ہوں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی روزی کو پاکیزہ بنائے۔ کیوں کہ حرام خور جنت میں داخل نہیں ہو سکتا'' (۷۷)

حوالہ جات

۱۔ مولانا محمد علی جانباز، تاریخ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار، مکتبۂ نعمانیہ اُردو بازار گوجرانوالہ، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۵۳

۲۔ مجاہد حسین، بد عنوانی کی حکمرانی ایوب خان سے پرویز تک، الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص:۳۱۳

۳۔ پیر سید نصیر الدین نصیرؒ، علامہ، مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب ایک جائزہ، www.slideshare.com ۱۳، اگست ۲۰۱۹ء، 11:26am

۴۔ خورشید احمد، پروفیسر، جمہوریت پارلیمنٹ اور اسلام، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص:۱

۵۔ محمد عبد القادر عمادی، ڈاکٹر، ہندوستان کے سماجی مسائل، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص:۴۷

۶۔ شمیم حنفی، خیال کی مسافت، تخلیق کار پبلشرز یاور منزل لکشمی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص:۱۲۵

۷۔ شہزاد منظر، جدید اُردو افسانہ، منظر پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۴۸

۸۔ محمد الیاس، حیا (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، نواب پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص:۲۷

۹۔ ایضاً، ص:۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۰

۱۱۔ محمد فیروز، پروفیسر، دوزخ میں اک پہر (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی تادیب انٹرنیشنل، برطانیہ پاکستان، جلد ۱، شمارہ ۲، ۲۰۰۳ء، ص:۱۵۵

۱۲۔ محمد الیاس، مجبور (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اِک پہر، ص:۴۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۲

۱۴۔ ایضاً، ص:۴۴

۱۵۔ محمد فیروز، پروفیسر، دوزخ میں اک پہر (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی تادیب انٹرنیشنل، برطانیہ پاکستان، جلد ۱، شمارہ ۲، ۲۰۰۳ء، ص:۱۵۵

۱۶۔ حبیب الرحمان، مولانا، ناپسندیدہ اخلاق، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء، ص:۲۲

۱۷۔ محمد الیاس، ڈاکٹر لوگ، (افسانہ) مشمولہ: منظر پسِ غبار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص:۱۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۲۴

۲۰۔ محمد الیاس، ڈائری، (افسانہ) مشمولہ: منظر پسِ غبار، ص:۱۸۸

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۹۴

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۰۱

۲۳۔ راضیہ شمشیر، ڈائری، (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی تادیب انٹرنیشنل، برطانیہ، پاکستان، جلد۷، شمارہ۱۴، ۲۰۰۳ء، ص:۱۵۱، ۱۵۲

۲۴۔ محمد الیاس، ایسی ویسی بات، (افسانہ) مشمولہ: منظر پسِ غبار، ص:۱۲۹

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۳۶

۲۷۔ نسیم سحر، ایسی ویسی بات، (تبصرہ) مطبوعہ: ابلاغ، پشاور، جلد۷، شمارہ۸، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص:۱۰۵

۲۸۔ خالد یوسف، ایسی ویسی بات (تبصرہ) مطبوعہ: ابلاغ، پشاور، جلد۹، شمارہ۸، ۱۹۹۹ء، ص:۱۰۱

۲۹۔ محمد الیاس، درآمدی مہر (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۱۵۵

۳۰۔ ایضاً، ص:۱۶۰

۳۱۔ ایضاً، ص:۱۶۲

۳۲۔ محمد الیاس، ملمّع، (افسانہ) مشمولہ: منظر پسِ غبار، ص:۱۴۴

۳۳۔ ایضاً، ص:۱۴۴

۳۴۔ محمد الیاس، کھوٹے سمّے (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۶۴

۳۵۔ ایضاً، ص:۶۵

۳۶۔ ایضاً، ص:۶۸

۳۷۔ جامع اللّغات، گنج شکر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۳۸۶

۳۸۔ سیّد مرتضیٰ فاضل لکھنوی، نسیم اللّغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمٹیڈ، کراچی، ۱۹۸۴ء ص:۲۴۳

۳۹۔ محمد صادق، حکیم، ریاض الاخلاق، علی آصف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۱۷۳

۴۰۔ ابو الاعلیٰ سیّد مودودی، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، س ن، ص:۲۴۶

۴۱۔ محمد الیاس، امیر شہر کا ڈنکا (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۲۲

۴۲۔ ایضاً، ص:۲۳

۴۳۔ ایضاً، ص:۲۳

۴۴۔ محمد الیاس، دوزخ میں اک پہر، (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، ص:۱۶۱

۴۵۔ ایضاً، ص:۱۷۱

۴۶۔ ایضاً، ص:۱۷۴

۴۷۔ احمد ہمیش، دوزخ میں اک پہر (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی، تشکیل، کراچی، جلد ۴، شمارہ ۲، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵۳

۴۸۔ سیّد مصطفیٰ کریم، ڈاکٹر، بزمِ احباب قارئین (تبصرہ) مطبوعہ: ابلاغ، جلد ۱۴، شمارہ ۷۷، ۲۰۰ء، ص:۱۰۶

۴۹۔ حکیم محمد صادق، مولانا، ریاض الاخلاق، ص:۱۷۸

۵۰۔ محمد الیاس، بے نوا، (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، ص:۱۵۴

۵۱۔ ایضاً، ص:۱۵۵

۵۲۔ محمد فیروز شاہ، پروفیسر، بے نوا، (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی، تادیب، انٹرنیشنل، ۲۰۰۳ء، ص:۱۵۵

۵۳۔ محمد الیاس، محافظ (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۲۲۲

۵۴۔ ایضاً، ص:۲۲۳

۵۵۔ ایضاً، ص:۲۳۹

۵۶۔ احمد ہمیش، محافظ (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی، تشکیل، شمارہ ۳، جلد ۷، ۱۹۹۶ء، ص:۳۲۸

۵۷۔ محمد الیاس، شاعر (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، ص:۵۳

۵۸۔ ایضاً، ص:۵۴

۵۹۔ ایضاً، ص:۵۶

۶۰۔ فیروز شاہ، شاعر (تبصرہ) مطبوعہ: سہ ماہی تادیب، انٹرنیشنل، جلد ۱، شمارہ ۲، ص:۱۵۵

۶۱۔ محمد الیاس، سانونی سلونی، (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، ص:۶۱۸

۶۲۔ ایضاً، ص:۲۲۱

۶۳۔ محمد الیاس، لنڈا ٹنڈا، (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۴۲

۶۴۔ ایضاً، ص:۴۵

۶۵۔ حکیم محمد صادق، مولانا، ریاض الاخلاق، ص:۱۷۸

۶۶۔ محمد الیاس، نیلام، (افسانہ) مشمولہ: دوزخ میں اک پہر، ص:۸۱

۶۷۔ ایضاً، ص:۸۶

۶۸۔ محمد الیاس، عظیم فلاحی مرکز، (افسانہ) مشمولہ: منظر پس غبار، ص:۱۸۶

۶۹۔ ایضاً، ص:۱۸۴

۷۰۔ ایضاً، ص:۱۸۵

۷۱۔ ایضاً، ص:۱۸۷

۷۲۔ القرآن، سورۃ لقمان، آیت:۱۴

۷۳۔ محمد الیاس، کفایت، (افسانہ) مشمولہ، دوزخ میں اک پہر، ص:۱۹۹

۷۴۔ ایضاً، ص:۱۹۳

۷۵۔ سلیم بن عید الہلالی، بربادئ اعمال کے اسباب، نور اسلام اکیڈمی ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۴۷

۷۶۔ ترمذی، حدیث:۱۳۱۹

۷۷۔ صلاح الدین یوسف، حافظ، حقوق و فرائض پر امن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد، مون مارکیٹ، اقبال ٹاؤن، لاہور، س ن، ص:۲۳۱

باب چہارم:

ماحصل

i. مجموعی جائزہ:

محمد الیاس جدید دور کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ بچپن سے ہی لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے تھے۔ شاعری بھی کی اور ان کی بے چین طبیعت نے انہیں افسانہ نگاری کی طرف بھی مائل کیا۔ مگر باقاعدگی سے نہ لکھا والد صاحب کا انتقال اِن کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ لہٰذا میٹرک کے بعد مختلف کاروبار کرتے رہے۔ لیکن ۱۹۹۵ء میں اپنے بیٹے کے انتقال کی وجہ سے بہت افسردہ ہو گئے۔ انہوں نے بیٹے کی یاد میں ''بوسہ وداع'' لکھ کر باقاعدہ اپنے فن کی ابتدا کی اور اُس کے بعد مسلسل لکھتے رہے۔ اِن کا تعلق گجرات سے تھا۔ اِن کے افسانوں میں ہمیں زیادہ تر غریب طبقہ نظر آتا ہے۔ غربت اور حالات کے ستائے ہوئے ہر طرح کے کردار اِن کے ہاں نظر آتے ہیں۔ بھٹے پر کام کرنے والے جاگیرداروں کے مزارع، مفلوک الحال عورت، سیاست دانوں کی چالاکیاں، اور نام نہاد مولویوں کی منافقت غرض معاشرے کو تباہ کرنے والے اور معاشرے کے تباہ حال افراد اِن کے ہاں موجود ہیں۔ انہوں نے اِن کرداروں کو اِس طرح پیش کیا کہ وہ سب حقیقت لگنے لگتے ہیں۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا یہ افسانہ نگار امیروں کی طرزِ معاشرت بھی دکھاتا ہے اور غریب غرباء کے دکھوں، پریشانیوں کا مداوا بھی انہی کہانیوں کی صورت میں کرتا ہے۔ اِن کے چاروں افسانوی مجموعوں کے کردار ظلم و ستم کی چکّی میں پستے نظر آتے ہیں۔ وہ ظلم چاہے آقا کا اپنے غلام کے ساتھ ہو، خاوند کا بیوی کے ساتھ، پولیس کا عام شہری کے ساتھ یا سیاست دانوں کا عوام کے ساتھ۔ غرض اِس معاشرے میں اِنسان کے ہاتھوں اِنسان پر ہونے والے ظلم کی داستان اِن کہانیوں میں موجود ہے۔ مگر ظلم سہنے والا اور دھوکہ کھانے والا بولنے کی ہمت اور طاقت نہیں رکھتا کیونکہ اِس نظام کو ایسا بنا دیا گیا ہے کہ اِنسان بولتے ہوئے ڈرتا ہے اور اپنی معصومیت اور بھولے پن میں جان کی امان کے لیے چپ کی چادر اوڑھ کر بس گزارہ کرنے کے فارمولے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اِن کا کلی مزاج نچلہ طبقہ ہے۔ حقیقت نگاری کی تحریک سے متاثر بھی تھے لہٰذا ایک سماجی حقیقت نگار کے طور پر

سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی گرد و پیش کی زندگی کے مسائل کو افسانوں میں جگہ دی۔ معاشرے کی ناہمواری، انسانیت کی بے توقیری، دھوکہ دہی، بناوٹ، بدعنوانی جیسے موضوعات اِس سماج کا حِصّہ ہیں۔ آج کے دور میں بھی عورت اُسی طرح مصیبتیں کاٹتی اور دُکھ جھیلتی نظر آتی ہے۔ عوررت اُسی طرح روایات کی زنجیر میں قید ہے۔ اِن پابندیوں کے باوجود اپنے حقوق کے لیے آواز ضرور اُٹھاتی ہے۔ مصنّف نے ایسی زندگی کو پیش کیا جس کو مصنّف نے بہت قریب کی آنکھ سے دیکھا۔ اِن کی کہانیوں میں قاری کو اِسی لیے کشش محسوس ہوتی ہے کہ جو جیسا ہے ویسے ہی بیان ہوا ہے۔ حامد سروش رقم طراز ہیں۔

> ''محمد الیاس کی بھی کیا بات ہے۔ افسانہ لکھتے ہیں تو کردار اِس کے اندر سے نکل کر حقیقی زندگی کے کرداروں کی طرح ہمارے سامنے چلتے نظر آنے لگتے ہیں''(۱)

اِن کہانیوں سے قاری بصارت اور بصیرت دونوں سے فیض یاب ہوتا ہے۔ حکمرانوں کی سیاست، غربت و جہالت، کرپشن، منافقت ظلم و بربریت، دراصل اِن افسانوں کے تحریر کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ پتہ چلے کہ جو معاشرے اِس روش پر چل نکلتے ہیں۔ عذاب الٰہی کا مرتکب ٹھہرتے ہیں۔ اِن کا مطالعہ کرنے سے معاشرے کو اپنی خامیوں اور نقائص کا پتہ ہے۔ ایک بے ضمیر بے حِس انسان کے اندر ندامت کی ہلکی سے ارتعاش پیدا ہونا بھی بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ فرشتے، ڈوگرا اور التکاثر میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو ہمیں سماج میں چلتے پھرتے اِنسانوں کی زندگی کی حقیقت دکھاتے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے تو کوئی معاشرہ بھی پاک نہیں مگر بحیثیت مسلمان اِن کا ارتکاب کرتے ہوئے خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک طرف ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو دوسری طرف ہمارا طرزِ عمل انتہائی افسوس ناک اور قابلِ مذمت ہے۔ ''ایک بٹا چھ'' اور ''انا'' اُن غریب خاندانوں کی کہانی ہے جس سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے کسی سے دستِ سوال دراز نہیں کرتے مگر مجبوری میں زندگی گزارنے کا ایک ایک لمحہ لمحہ انتہائی جان لیوا اور تکلیف دہ ہے۔ منافقت زدہ معاشروں کی معافی نہ اللہ کے ہاں اور نہ بندوں کے ہاں۔ یہاں محمد الیاس نے ایسے منافق انسانوں کو پیش کیا جو خود کو متقی پرہیز گار ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کا ڈر اور خوف لوگوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حقیقت میں خود اتنے عیاش اور مکّار ہوتے ہیں ایسے میں وہ صرف اور صرف خود کو دھوکہ دینے کی بیوقوفی کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ دین کے رہتے ہیں اور نہ آخرت کے ''کفایت'' اور ''پورا تول'' میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو اپنے جسم میں دل نام کی کوئی چیز نہیں رکھتے۔ بے حسی بھی

معاشرے کے زوال کی ایک صورت ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو بے حسی اُس برف کی مانند ہوتی ہے جو تہہ در تہہ جمتی رہتی ہے اور سورج کی روشنی کو اندر آنے کا راستہ نہیں دیتی۔ انسان کا دل بھی اُس ٹھنڈی موٹی برف کی مانند ہو جاتا ہے اور وہ کسی بھی رشتے ناطے کا لحاظ نہیں کرتا کیونکہ رشتوں کی گرمی اُس تک پہنچ نہیں پاتی کہ وہ پگھل کر نرم ہو سکے۔ اِسی طرح دوسرے دو مجموعے ''دوزخ میں اک پہر'' اور ''منظر پس غبار'' جو کہ ۲۰۰۰ اور ۲۰۰۵ میں لکھے گئے میں بھی وہ موضوعات نظر آتے ہیں۔ بدعنوانی یہاں بھی نظر آتی ہے۔ منافقت بھی ہے۔ استحصال یہاں بھی موجود ہے۔ اپنے چاروں مجموعوں میں مصنف کا انہی موضوعات کو نمایاں کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہی چیزیں پہلے انفرادی اور پھر اجتماعی طور پر زہر کی طرح قوم کی زندگیوں میں سرایت کر جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ افسانہ ''حیا'' اور ''مجبور'' بھی ایسے افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کے نام میں ہی طنز کی شدید کاٹ موجود ہے۔ ملکی نظام سنبھالنے والے ہر بُرائی ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ مگر حیا نام کو نہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ تمام قومی خزانہ لوٹ کر بھی لاچار و مجبور ہیں۔ ''دوزخ میں اک پہر''، ''بے نوا'' اور ''امیر شہر کا ڈنکا'' جیسے افسانے لاقانونیت اور فساد کی کہانی سنا رہے ہیں۔ غرض اِن افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقیقت نگاری کی جو روایت پریم چند سے شروع ہوئی تھی مصنف نے اُسی روایت کو قائم رکھا اور ویسے بھی دیکھا جائے تو ۹۰ کی دہائی میں افسانہ نگاروں نے ایک دفعہ پھر حقیقت نگاری کی طرف رُخ کیا اور محمد الیاس بھی ۹۰ کی دہائی کے حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ بنیادی بات جو اِن افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کو تباہی کی طرف لے جانے والا طبقہ سیاست دانوں کا ہوتا ہے۔ ملکی باگ ڈور سنبھالنے والے جب شروعات کرتے ہیں تو اپنی انا میں، جہالت، خود غرضی کی بنا پر وہ ملک کو کوڑا دان بنا دیتے ہیں۔ جس میں ہر بندہ اپنے اپنے حِصّے کا گند ڈالنا فرض سمجھتا ہے۔ اس میں سے منافقت زدہ مکھیاں بھی نکلتی ہیں۔ بدعنوان مچھر بھی آتے ہیں۔ اور بے حسی کے جراثیم بھی پرورش پاتے ہیں۔ یہ سارے مل کر قوم کو مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں جن کی سڑاند اور بُو تو ہر کسی تک پہنچتی ہے مگر اِن سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔

محمد الیاس اور اِن جیسے دیگر مصنفین پڑھنے والوں کو یہ جرأت عطا کرتے ہیں کہ اپنا محاسبہ کر کے معاشرے کو تباہی سے بچائیں محمد الیاس یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ افسانوں میں حقیقت ہو گی تو افسانہ، صحیح معنوں

میں افسانہ کہلائے گا۔ اُنہوں نے حقیقت نگاری کو ترجیح دی۔ اِن کے افسانے ہمیں زندگی کا سچا رُوپ دکھاتے ہیں۔ نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں۔

> ''اس میں کیا شک ہے کہ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں ہر طرح کے کردار پائے جاتے ہیں مگر اِن زندہ کرداروں کو پیش کرنے اِن پر لکھنے کی جرات کم ہی قلم کاروں کو ہوتی ہے۔ یہ محمد الیاس کی دلیری ہے کہ انہوں نے بغیر لگی لپٹی رکھے اِن کرداروں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ زندگی کو اسی رنگ میں پیش کرتے ہیں جیسی وہ ہے''(۲)

ii. نتائج:

محمد الیاس کے اُردو افسانوی مجموعوں ''دوزخ میں اِک پہر''، ''منظر پسِ غبار''، ''مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں''، ''لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں'' میں سماجی حقیقت نگاری اور اخلاقی زوال کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے درج ذیل نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

سماجی حقیقت نگاری سے مراد سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو من و عن بیان کرنا کہ اُس کی اصلیت واضح ہو جائے۔ مختلف افسانہ نگاروں کی تعریفوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ خیالی دنیا کی بجائے حقیقی زندگی کی اصلی شکل وصورت کو موضوع بنانا حقیقت نگاری ہے۔

تحقیق کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصنف نے اپنے چاروں افسانوی مجموعوں میں سماجی حقیقت نگاری کو خوبصورتی سے برتا ہے۔ اِن کے ہاں زیادہ تر غریب طبقے کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ اِن کی کہانیوں میں بد عنوان استحصال اور منافقت زدہ معاشرے کی عکاسی ملتی ہے۔

مصنف کے چاروں افسانوی مجموعوں کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اِن کے ۹۰ کی دہائی اور اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے افسانوں میں پیش کی جانے والی زوال کی صورتوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ۹۰ کی دہائی میں جمہوریت کا دور تھا اور اکیسویں صدی کے آغاز میں مارشل لاء کا راج تھا لیکن کیونکہ جمہوریت کا دور بھی مارشل لاء کے دور جیسا ہی تھا۔ لہٰذا دونوں ادوار میں غربت، تنگدستی اور ناانصافی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اخلاقی زوال کی صورتیں بھی تقریباً ایک جیسی ہی ہیں۔

iii. سفارشات:

محمد الیاس ایک سماجی حقیقت نگار ہیں۔ لہٰذا اِن کے افسانوں کا پریم چند کے سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں کے ساتھ تقابل کیا جاسکتا ہے۔

ان کے دیگر افسانوی مجموعوں ''صدیوں پر محیط اک سفر'' اور گلیوں اور بازاروں میں بھی سماجی حقیقت نگاری موجود ہے۔ لہٰذا اِن افسانوی مجموعوں کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

مصنف نے ''برف اور کہر'' جیسے اعلیٰ پائے کے ناول تحریر کیے ہیں۔ جس کا موضوع اخلاقی بے حسی ہے۔ اِن کے ناولوں پر بھی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامد سروش، بزم احباب قارئین (تبصرہ) مطبوعہ، ماہنامہ، ابلاغ، اکتوبر، ۱۹۹۹ء، ص، ۱۰۵

۲۔ نصیر احمد ناصر، بزم احباب قارئین (تبصرہ) مطبوعہ، ماہنامہ، ابلاغ، اکتوبر، ۱۹۹۹، ص، ۱۰۶

کتابیات:

(الف) بنیادی ماخذ:

محمد الیاس، لوح ازل پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۵ء

محمد الیاس، مور پنکھ پہ لکھی کہانیاں، نقشِ خیال، میر پور، ۱۹۹۷ء

محمد الیاس، منظر پس غبار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

محمد الیاس، دوزخ میں اک پہر، نواب پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

(ب) ثانوی ماخذ:

ابو الکلام آزاد، مولانا، اسلام اور جمہوریت، طیب پبلشرز، اُردو بازار، لاہور، س ن

اختر حسین رائے پوری، ادب اور زندگی، انجمن ترقی ادارہ اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۵ء

اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء

امیر شکیب ارسلان، علامہ، اسباب زوالِ اُمت کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی، س ن

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بُک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، دہلی، ۲۰۰۴ء

اوپندر ناتھ اشک، کونپل، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۴۰ء

جمال نقوی، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک کا سفر، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۸ء

حامد سعید اختر، بریگیڈیئر، ریاست، سیاست اور قیادت، پبلشرز اے پہاولپور، لاہور، ۲۰۰۲ء

حبیب الرحمٰن، مولانا، ناپسندیدہ اخلاق، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء

حشرت رومانی، چند ہم عصر افسانہ نگار، جاوداں پبلی کیشنز ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۴ء

حکیم محمد صادق، مولانا، ریاض الاخلاق، علی آصف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء،

حیات اللہ انصاری، شکستہ گنگورے، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۵ء

خاور جمیل، نئی تنقید، رائل بُک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵

خلیل الرحمن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء

خورشید احمد، پروفیسر، جمہوریت پارلیمنٹ اور اسلام، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

راجہ شکیل انجم، ادب زندگی ہے، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء
راجندر سنگھ بیدی، اپنے خواب مجھے دے دو، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
رئیس قمر، ڈاکٹر، سید عاشور کاظمی (مرتبین) ترقی پسند ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء
سعادت حسن منٹو، منٹو کے افسانے، انجمن ترقی اُردو، لاہور، ۱۹۴۱ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
سلیم بن عید الہلالی، بربادیٔ اعمال کے اسباب، نور اسلام اکیڈمی ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۰ء
سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، س ن
شارب ردولوی، پروفیسر (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تنقید، اُردو اکادمی، دہلی، س ن
شفیق انجم، ڈاکٹر، اُردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
شکیل الرحمٰن، منٹو شناسی، پاکیزہ آفیسٹ، پٹنہ، ۱۹۹۷ء
شکیل احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، ڈومن پورہ، ۱۹۸۴ء
شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین، اُردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء
شمیم حنفی، پریم چند کے افسانے، انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
شمیم حنفی، خیال کی مسافت، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۷ء
شہزاد منظر، جدید اُردو افسانہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء
شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء
صدیق احمد، پروفیسر، ادب اور زندگی، اُردو گھر علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
صلاح الدین یوسف، حافظ، حقوق و فرائض پر امن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد، اقبال ٹاؤن، لاہور، س ن
عزیز احمد فردوس، انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو ادب کے افسانوی اسالیب، ہائر کمیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، س ن
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو نثر کا فنی ارتقاء، عفیف پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۳ء
فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
گوپی چند نارنگ، اُردو افسانہ روایت و مسائل، سنگِ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۱ء
لیاقت علی خان، نیازی، ڈاکٹر، اسلام کا نظامِ حیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد امین بھٹی، اظہر اللغات (جامع اُردو) اظہر پبلشرز، لاہور، س ن
مجاہد حسین، بدعنوانی کی حکمرانی ایوب خان سے پرویز تک، اُردو بازار لاہور، ۲۰۰۹ء
محمد حفظ الرحمٰن، مولانا، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، س ن
محمد رفیع صاحب، مولانا، جامع اللغات، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۱ء
مشرف احمد، (مرتب) کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ، نفیس اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۱ء
محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء
محمد عبدالقادر عمادی، ڈاکٹر، ہندوستان کے سماجی مسائل، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء
مولانا محمد علی جانباز، تاریخ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار، مکتبۂ نعمانیہ اُردو بازار، گوجرانوالہ، ۲۰۰۱ء
نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، بُک وائز ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء
نور سلطان نذر، اکیسویں صدی کی دہلیز پر، اسد پرنٹرز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
وارث سرہندی، علمی اُردو لغت، علمی کتب خانہ اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۳ء
یوسف تقی، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اُردو نظم، پرنٹر دِل آفیسٹ، کلکتہ، ۱۹۸۰ء

عربی کتب:

القرآن، سورۃ النساء، آیت: ۴۵، ۱۴۵ سورۃ الفجر، آیت: ۱۰، ۱۱، سورۃ لقمان، آیت: ۱۴
ترمذی، حدیث: ۱۳۱

رسائل:

ابلاغ، شمارہ ۴، ۲ پشاور، ۱۹۹۵ء
ابلاغ شمارہ ۷، پشاور، ۱۹۹۶ء
ابلاغ، شمارہ ۶، ۷، پشاور، ۱۹۹۷ء
ابلاغ، شمارہ، ۲، پشاور، ۱۹۹۸ء
ابلاغ، شمارہ، ۱، ۵، ۸ پشاور، ۱۹۹۹ء
ابلاغ، شمارہ، ۲، پشاور، ۲۰۰۲ء

ابلاغ، شمارہ ۲۷، پشاور، ۲۰۰۳ء

اقدار، شمارہ ۳، ۱۱، کراچی

تادیب، شمارہ ۲، ۱۴ انٹرنیشنل، ۲۰۰۳ء

تجدید نو، شمارہ ۴، لاہور، ۱۹۹۵ء

تشکیل، شمارہ ۲۴، کراچی، ۱۹۹۶ء

رابطہ، شمارہ ۷، کراچی، ۱۹۹۶ء

سیپ، شمارہ ۶۶، کراچی، ۱۹۷۲ء

اصریر، شمارہ ۵، ۷، کراچی، ۱۹۹۷ء

فنون، لاہور، ۱۹۹۴ء

گل بدن سہوان، شمارہ ۱۳، یوپی انڈیا، ۱۹۹۸ء

اخبارات:

روزنامہ، پاکستان راولپنڈی، ۱۹۹۹ء

روزنامہ، مساوات، راولپنڈی، ۱۹۹۰ء

انٹرویوز:

تزئین تاباں (انٹرویو) از صائمہ میر، راولپنڈی، ۲۸، جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۱:۰۰

رشید امجد، ڈاکٹر (انٹرویو) از صائمہ میر، اسلام آباد، ۹، جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۱۱:۴۵

سیّد مسعود اعجاز بخاری (انٹرویو) از صائمہ میر، میر پور، ۱۵، اگست، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۴:۱۵

محمد الیاس (انٹرویو) از صائمہ میر، راولپنڈی، ۲۸، جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۱۲:۳۰

محمد افضال بٹ، ڈاکٹر (انٹرویو) از صائمہ میر، ۶، اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت، ۱۱:۱۵

منیر یزدانی، پروفیسر، (انٹرویو) از صائمہ میر، میر پور، اکتوبر، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۱۱:۰۰

ویب گاہیں (انٹرنیٹ ذرائع):

http://www.urdupoint.com

www.Wikipedia.org.com

http://www.slideshare.com

https://www.thenews.com.pk